۱۹۸۳ء کی بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کے پس منظر میں لکھا جانے والا ادب
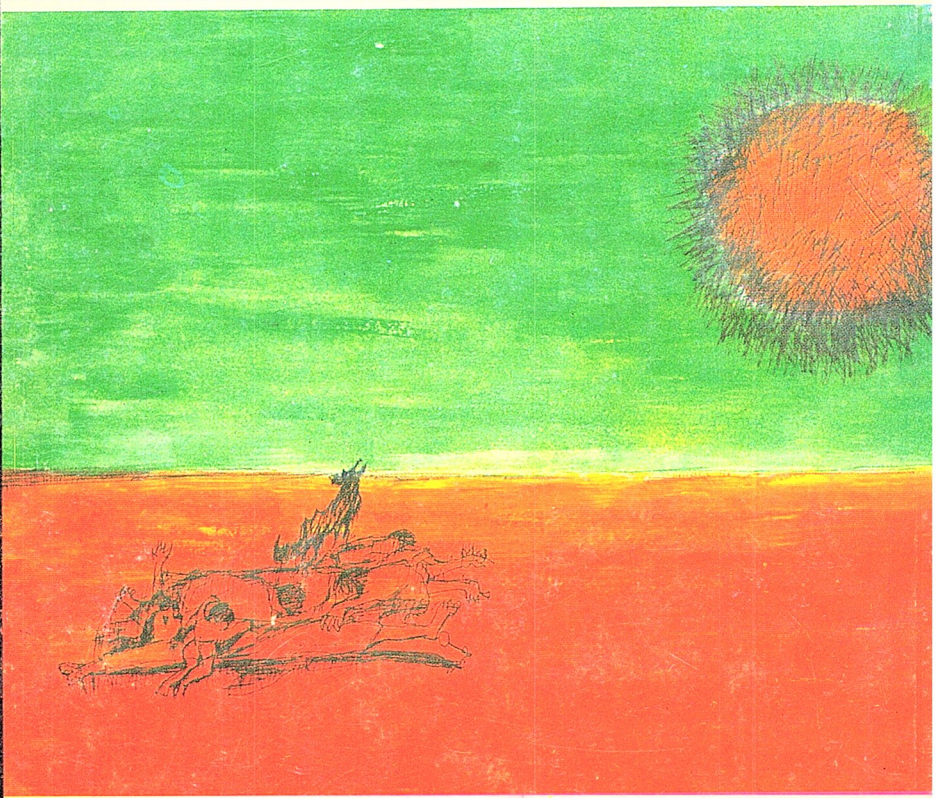
ترتیب :

احمد سلیم
شاہ محمد پیرزادو

سارا مُلک منصور

سارا ملک منصوُر

ترتیب :

احمد سلیم
شاہ محمّد پیرزادو

کتاب پبلیکیشنز۔ کراچی

زندگی کے نام!

ملڪ مڙ وٺي منصور، ڪُهي ڪُهندين ڪيترا؟

سارا مُلک منصور، ذبح کرو گے کتنے ؟

شاہ عبداللطیف بھٹائی

همه منصور هزار، ڪهڙا اچاڙ هيو چاڙهيئين؟

سب منصور ہزار ، کتنے دار چڑھاؤ گے ؟ شاہ عبداللطیف بھٹائی

فہرست

شاعری

آوازیں

یہ کتاب ایک دستاویز ہے اور ایک وعدہ - اس میں شامل کہانیوں اور نظموں کو ترتیب دیتے ہوئے، اس کے اوراق میں سے، چند لفظ ہمیں اپنے معنوں کی نئی خوشبو دے گئے - ان لفظوں میں موت، وطن، انسان، تشدد، جدوجہد اور زندگی مل کر ایک نہ ختم ہونے والی کہانی کو ترتیب دیتے ہیں - یہ کہانی اب بھی لکھی جا رہی ہے -

آج سے چند ماہ پیشتر، جب ہم نے سادہ انداز میں یہ سوچا کہ ۸۳ء کی بحالی جمہوریت کی تحریک کے پس منظر میں لکھی جانے والی سندھی کہانیوں اور نظموں کا ایک مجموعہ ترتیب دے کر اسے اردو میں شائع کیا جائے تو اُس وقت بھی، ہمیں اسی کام کی مشکلات کا بخوبی اندازہ تھا - مشکل یہ نہیں تھی کہ یہ تحریریں کہاں سے اور کیسے ملیں گی، اس کے برعکس سنگین بات یہ تھی کہ یہ ممنوعہ چیخیں اور نعرے سینکڑوں صفحات میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے اور ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ انہیں چار یا چھ جلدوں میں ترتیب دے کر اس دستاویز کو تاریخ

کے سپرد کر دیا جائے۔ لہذا ہمیں انتخاب کے انتخاب کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ مالی طور پر اپنے بے وسیلہ ہونے کے سبب، ہمیں اس مجموعے میں سراج کی کارونجھر کے مور، امر جلیل کی' رنی کوٹ کا خزانہ، اور کئی دوسری کہانیاں اور نظمیں اس مجموعے میں شامل نہ کرنے کا افسوس ہے۔

ایک مشکل کا البتہ ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ اس مجموعے کو ترتیب دینے کا فیصلہ کرتے وقت ہمارے ذہن میں صرف سندھی زبان تھی لیکن اس پر کام کرتے ہوئے، ہماری نظر سے اردو کی بعض ایسی چیزیں گزریں، جن کا نہایت کڑا انتخاب اس مجموعے میں شامل ہے۔ جہاں شیخ ایاز، سراج الحق میمن، رسول بخش پلیجو، نور الہدیٰ شاہ، بدر ابڑو، ف۔م۔ لاشاری، میر محمد پیرزادو، شاہد بھٹو، ساغر سیمجو، فیض پیرزادو، جان خاصخیلی اور شاہ محمد پیرزادو کے نام اپنے عہد کے گواہ اور ترجمان بن کر اُبھرے وہیں فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، گوہر سلطانہ عظمیٰ اور احمد سلیم کے نام بھی اس حرف حق میں ہم آواز ہو گئے۔ سندھی کے مقابلے میں اردو اور پنجابی کے یہ انتہائی مختصر نام جہاں اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ سندھ کو، پورے پاکستان کی جنگ تنہا لڑنا پڑی، وہاں وہ اس امید کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ یہ چند نام آگے چل کر چند نام نہیں رہیں گے۔

اس مرحلے پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ جیساکہ ابھی ہم نے کہا۔ سندھ کو پورے پاکستان کی جنگ تنہا لڑنا پڑی لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ پاکستان کے دوسرے علاقوں سے

حق کی آواز ہی بلند نہ ہوتی ہو۔ ۱۹۸۳ء کی تحریک کے حوالے سے
سندھی ادبی سنگت کراچی میں قرار داد پاس ہونے سے پہلے لاہور
کے تیرہ صحافی اور ادیب جن میں انور سجاد، منو بھائی، شفقت تنویر
مرزا، مسعود اشعر اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے، اپنی نوکریوں
سے نکال دیئے گئے اور ریڈیو ٹی وی پر بین کر دیئے گئے۔ ریڈیو ٹی وی
پر بین کئے جانے کی کارروائی کراچی میں شوکت صدیقی کے خلاف
بھی کی گئی۔ شفقت تنویر مرزا، مسعود اشعر اور بعض دوسرے صحافی
پریس ٹرسٹ کے اخبارات میں اپنی ملازمتوں پر اب تک بحال
نہیں کئے گئے۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کی تخلیق میں
وہ خاموش آوازیں بھی شامل ہیں جو ظلم کے سامنے بہرحال خاموش نہیں رہیں۔
اس اعتبار سے یہ سب آوازیں مل کر، بدر ابڑو کے
لفظوں میں ایک آواز بن جاتی ہیں کہ بالیاں تیز دھوپ میں
پکتی ہیں اور ذہن دکھ کے تنور میں۔
اور ذہن اپنے تخلیقی عمل میں بندوقوں کے سامنے
تن جاتا ہے۔

احمد سلیم
شاہ محمد پیرزادہ
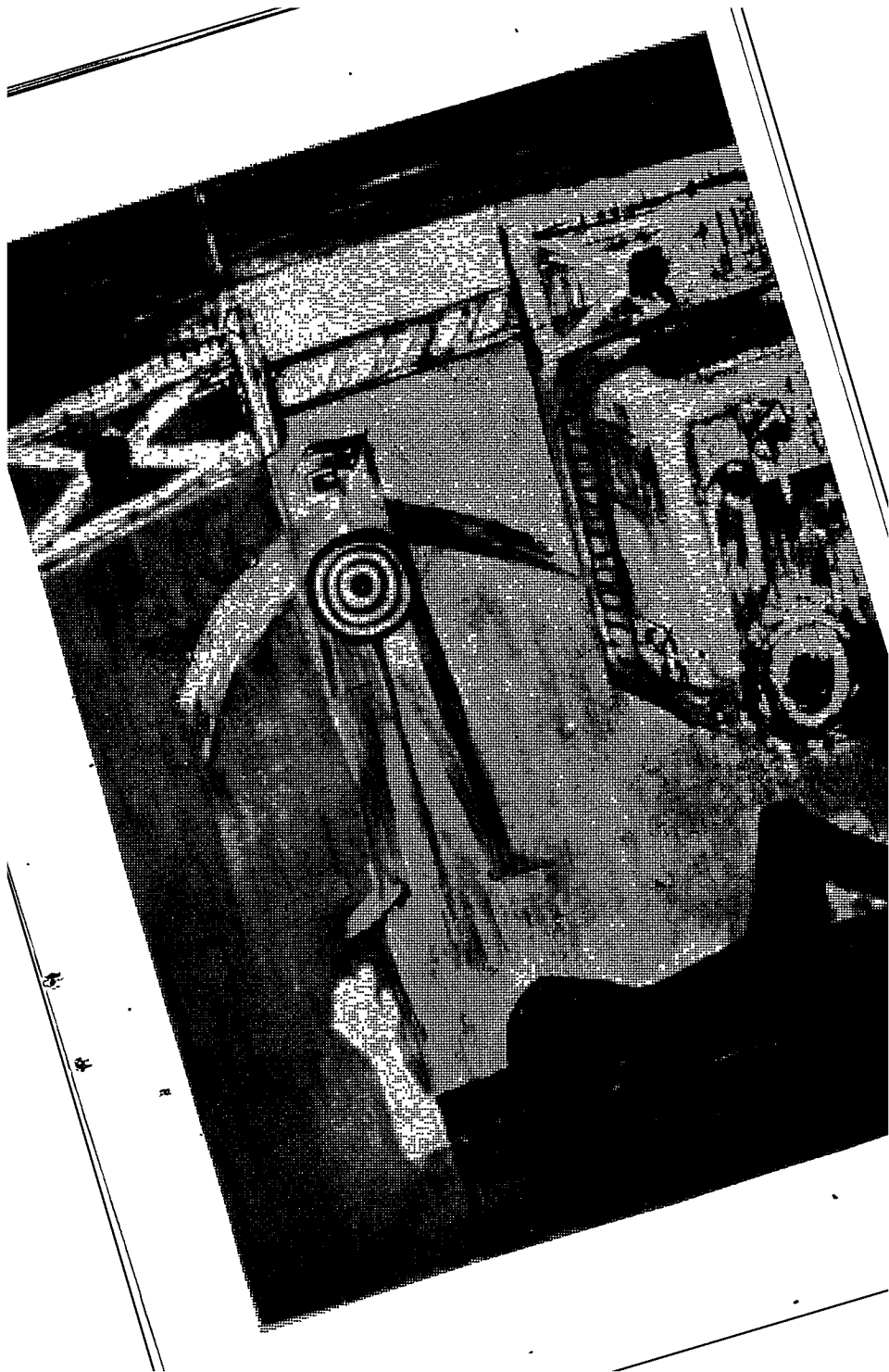
آٹھواں آدمی

سراج الحق میمن

اُس رات اُسے الٹا لٹکایا گیا... اُس رات آسمان پر تھوہر اگ آئے تھے؟
چھت سے اُلٹا لٹکتے، آہنی سلاخوں کے اُس برآمدہ کی ترچھی چھت کی اوٹ سے اس کی خون آلود نگاہوں میں، آسمان کا صرف ایک تکونا ٹکڑا سما سکا تھا۔ آسمان جو آزاد تھا، لیکن لہولہان لگتا تھا۔ لہو اس کی آنکھوں کی پتلیوں سے چھلکنے لگا۔ اُس کی آنکھیں اس کے لہو کے بوجھ سے چندھیانے لگیں اسے محسوس ہوا جیسے آسمان پر تھوہر اگ آئے تھے۔ جو اس کی آنکھوں کو، اُن کی نگاہوں کو جھلسا رہے تھے۔ آسمان کا وہ تکونا ٹکڑا اس کی آنکھوں میں در آیا تھا اور اس کے کونے یکے بعد دیگرے پھیل جاتے تھے۔ اس مثلث میں کتنے تارے ہوں گے؟ اس نے سوچنا چاہا۔ لیکن اس سوچ کو آتے آتے کئی برس گزر گئے... آسمان کا مثلث واپس لوٹ گیا۔ اور ٹیڑھی میڑھی کرنوں کا تھوہر اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں چبھنے لگا۔ اس کے دل نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر، اس تھوہر کو روک لے، اس کی آنکھوں کی پلکیں اس تھوہر کے بوجھ اٹھانے سے عاجز آ چکی تھیں اس نے کوشش کی کہ وہ پلکوں کو گرا دے بند کر دے۔ تاکہ تھوہر کی کرنیں اس کی پتلیوں میں چبھ نہ سکیں۔ لیکن لہو کے طوفانی دھارے نے اس کی پلکوں کو بند نہ ہونے دیا۔ اس لمحے اسے خیال آیا کہ جیسے اس کی آنکھیں ایک برج تھیں اور اس کی پلکیں اس برج کے دروازوں کی مانند تھیں جو لہو کے دریا کے آگے بالکل بے بس تھے یہ خیال آتے ہی لہو کی ایک آندھی اس کے جبڑوں میں کھولنے لگی اس کی کنپٹیوں میں نوبتیں بجنے لگیں اس کی داڑھی کے بال کھڑے ہو کر اس کی گالوں میں چبھنے لگے "مجھے سوچنا نہیں چاہیے"، اسے معاً خیال آیا "ورنہ خون پھر بہنے لگے گا"

اور پھر یہی ہوا۔ خون کی ایک دھار اس کے ہونٹوں کے کنارے سے بہہ کر داڑھی کے بالوں میں ہوتی ہوئی۔ کنپٹی کے آس پاس بالوں میں پھیل گئی اور پھر کان کی لو کے پیچھے سے قطرہ قطرہ ہو کر فرش پر گرنے لگی اور چند لمحوں بعد اس خون سے ایک مستطیل بن گیا آسمان کا ازدمثلث خون کا غلام مستطیل بن گیا یہ سوچ اس کے ذہن میں درد کی ایک لہر بن کر ابھری۔ یہ خیال درد کی لہر کے ساتھ، اس کے پیشانی اور کنپٹیوں میں ذرا رک کر اور اوپر بڑھنے لگا۔ خیال اور درد کی یہ لہر اس کے جبڑوں سے ہوتی ہوئی، اس کے دونوں کندھوں سے اچھل کر اس کے بازوؤں کے پٹھوں میں دھڑکنے لگی۔ خیال اور درد کی یہ لہر لحظہ بہ لحظہ وزنی ہوتی گئی اس کے بازوؤں کے پٹھوں میں مینڈک تڑپنے لگے اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے پٹھوں کی نسیں اس وزن سے یک لخت ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔ درد کی یہ شاخ اس کی کہنیوں کو کاٹتی، کلائیوں کو چیرتی، ہاتھوں کی دس کی دس انگلیوں کے اٹھائیس پوروں میں دہکنے لگی سوچ کی دوسری شاخ حلق سے گزر کر اس کے دل اور پھیپھڑوں میں تڑپنے لگی اس لمحے اس کے ذہن میں ایک غیر محسوس سی امید نے کروٹ لی کاش یہ منزل درد کی اس شاخ کی آخری منزل ہو، کاش اس کا دل درد کی اس لہر اور اس سوچ کے سہارے ساکت ہو جائے اور اس کی پلکیں اس کی باہر نکلتی ہوئی پتلیوں پر گر گر جائیں اس کی یہ آس پوری نہ ہوئی۔ درد کی یہ شاخ لہو کے دریا میں شامل ہو کر اور اوپر چڑھنے لگی اور اس کی انتڑیوں سے گھستی، اس کی رانوں، گھٹنوں، پنڈلیوں اور ٹخنوں کو ڈبونے لگی۔

دفعتاً اس نے کرسی کے سرکنے کی آواز سنی، یہ آواز اس کے کانوں اور آنکھوں کے اتنی قریب تھی کہ اس کی من من بھر کی وزنی پلکیں تک جھپک پڑیں لہو کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجنے لگی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں نے یہ آواز سنی تھی اور اس کے کانوں نے یہ آواز دیکھی تھی اس کا جسم اینٹھ گیا، آسمان کا مثلث اور روشنی کا تھوہر کسی خواب کے چورا ہے پر اس کی زخمی نظروں کی مسافت میں اوجھل ہو گئے اور اس کی بجائے خاکی ڈریس کا ایک مستطیل اس کی پتلیوں میں در آیا۔

"ادمئے ..... اب بھی نام نہیں بتاؤ گے؟"

گالی دینے والی ہونٹ اس کی نظر کے مستطیل سے بالکل باہر تھے۔ شاید اس لئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ گالی اس کے اور خاکی ڈریس کے مستطیل کے فاصلوں میں معلق ہو گئی تھی اس

کے کانوں کے بجائے اس کی آنکھوں نے اس گالی کو دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ ایسے میں اس نے کرسی کے سرکنے کی بازگشت اپنے بہت قریب محسوس کی ایک موہوم سا خیال اس کی سوچ کی تہوں میں ہچکولے کھانے لگا کہ وہ گالی کرسی کی طرح لکڑی سے بنی ہوئی ہے۔ شاید وہ گالی اور وہ کرسی ایک ہی لکڑی سے بنی ہوئی تھیں۔ اس کا زنگ اس کے تھوہر سے مستعار لیا گیا تھا جس کی نکوئی اُنیاں اس کی آنکھوں میں چبھتی جا رہی تھیں۔

"آخری بار کہہ رہا ہوں سچ سچ بتا دو کہ دوسرے کون تھے؟ ورنہ۔۔۔!"

اس کے کانوں کی دھونکنی میں یہ الفاظ دھم دھم کرنے لگے، میں اندر آنے کی بجائے؟۔۔۔ جیسے یہ الفاظ اس کے کانوں سے باہر نکلے تھے اور اس کے آس پاس کسی بگولے کی مانند گول گول دائروں میں منڈلا رہے تھے۔ "ورنہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ!" اس نے ان لفظوں کو اپنی خون آلود پتلیوں سے گھور کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے ان لفظوں کے بگولے کے پس پردہ دھندلاتی ہوئی چند شکلیں ڈوبتی ابھرتی نظر آئیں "ورنہ۔۔۔ تیری"

"ورنہ تیری ماں۔۔۔۔"

"ورنہ تیری بہن۔۔۔۔"

اس کی آنکھوں کی پتلیاں ان دھندلی صورتوں کے بار گراں سے اور باہر نکل آئیں اور ان صورتوں کی برہنگی اس کی پتلیوں کے لہو میں خون آلود ہو گئیں اس کے دل نے چاہا کہ وہ اس برہنگی کو بھول جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا بلکہ ایک دوسری برہنگی۔ خاکی ڈریس کی برہنگی۔ اس برہنگی کے اوپر جھولنے لگی اور پھر پہلی مرتبہ اس کی خون آلود آواز اس کے منہ کی چیرتی ہوئی ہلکی سی چیخ بن گئی۔

"ال۔۔۔ للہ!"

"بچو! ابھی تو اور خدا کی یاد کرو گے، جب تک نام نہیں بتاؤ گے، ایسے ہی الٹے لٹکتے رہو گے۔۔۔ بھلا پانی پیو گے؟"

اسے اپنے ہونٹوں کا صحرا ایا دکھایا۔ حلق کے سراب میں اس کی زبان لفظ "پانی" سن کر اور سوکھ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی زبان پر بھی تھوہر اگ آئے تھے نوکیلے اور بے شمار انیوں والے تھوہر اس کے گلے میں نیچے اترنے لگے نیچے اترتے کہیں اٹک گئے اور ان کی نوکیلی ٹہنیاں اس کے

حلق کو کھرچنے لگیں سوکھی کھانسی کے احساس سے ہی وہ کانپ اٹھا اب مجھے کھانسنا نہیں چاہیئے۔ ورنہ خون زخموں میں بہنے لگے گا۔ ابکایاں آنے لگیں گی اور درد بڑھتا چلا جائے گا۔۔۔۔

ایک بار پھر کرسی کے سرکنے کے زلزلے نے اس کے جسم کے آتش فشاں کو ہلا کر رکھ دیا خاکی ڈریس کا مستطیل اس کے قریب تر اور اس کی آنکھوں میں گھستا چلا آیا۔

"اچھا، چلو نام نہ بتاؤ، فقط اتنا بتا دو کہ اسلحہ کہاں چھپایا ہے؟"

اس نے یہ الفاظ اپنے جسم پر رینگتے محسوس کئے یادوں کے سرخ تتییوں کی مانند جو اس کی بغلوں کی چڈوں میں چمٹ گئے تھے اور اس کے پورے جسم میں ان سرخ پروں والے تتییوں کی یاد لوٹ آئی یہ تب کی بات تھی، جب خاکی ڈریس کا مستطیل ابھی نہیں بنا تھا۔ اس وقت تک صرف ایک کاٹھ کا آدمی تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں بید تھا اور دوسرے ہاتھ کی شہادت اور بیچ کی انگلیوں کے درمیان ایک سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ کاٹھ کے آدمی اور اس کے درمیان اگر کوئی رشتہ تھا تو صرف اتنا کہ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی اور یہ خالی ہاتھ تھا۔ چھڑی اور خالی ہاتھ کا رشتہ جرم کا رشتہ تھا۔ اس جرم پر اس نے صدیوں سے سوچا نہ تھا۔ اس نے صرف اتنا سوچا تھا کہ اس کے ہاتھ میں چھڑی نہیں ہونی چاہیئے یا مجھے خالی ہاتھ نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس سوچ سے بہت پہلے چھڑی اور خالی ہاتھ کے فاصلے سمٹ کر مینار اور قبرستان کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔۔۔۔ جوں جوں اس کے پیر سوجتے گئے تلوں تلوں بید کی چھڑی اس کی نظر کی آخری حد بن گئی تھی۔ اس حد نظر کے اس پار صرف آوازیں تھیں، بید کے شپ شپ کی آواز کاٹھ کے آدمی کے ہانپنے کی آواز اور اس کے پھیپھڑوں سے نکلنے والی کچلی ہوئی پامال آواز ان آوازوں میں ایک نیا رشتہ پیدا ہو چکا تھا۔ وقت کا رشتہ گنتی کا رشتہ، تسلسل کا رشتہ جب گنتی اس کی یادداشت کی حدوں کو پار کر گئی، جب تسلسل رفتار کے سراب میں بدل گیا جیسے بجلی کے پنکھے کے پر تیز رفتاری کی حد گزرنے پر ایک جگہ ساکت نظر آتے ہیں تب وقت منجمد ہو گیا، ناقابل برداشت درد بن گیا۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں اور دانتوں کو چیرتی ہوئی ایک آہ نکلی۔۔۔!

دفعتاً کاٹھ کے آدمی کی آواز منجمد وقت کو روندتی ہوئی اس تک پہنچی: اسے سؤر۔۔ تیلاتے ہو یار۔"

اس "یار" کے امکانات اس کے اردگرد منڈلانے لگے اس نے امکانات کو گھور کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں میں آندھیاں اٹھنے لگیں اور ان آندھیوں کے کہر میں یہ امکانات

خوف اور درد کے لیسے سائے بن کر ڈگمگانے لگے جو سنگین کی نوک سے باریک تر لیکن پل صراط سے کشادہ تر تھے۔

"اس کے کپڑے اتارو ... یہ ایسے نہیں مانے گا"...... کاٹھ کے آدمی کی آواز کی بازگشت اس کے سوچے ہوئے پیر دل سے ٹکرا کر اس کی شلوار اور کرتے کے دامن میں اٹک گئی اس کی آنکھوں کی آندھیاں ٹھہر گئیں اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

بنچ کی سرد لکڑی اور سرد برہنگی کے درمیان سرد سنگم کے احساس سے زیادہ اس نے کاٹھ کے آدمی کی آنکھوں میں برستے ہوئے پالے کی طرح سرد خون کی آنچ محسوس کی اور یہ احساس آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی جلد کہیں کہیں تھرکنے لگی اسے اپنا سفید بیل یاد آیا، جسے کٹنے کے موقع پر اس کی جلد مستقل تھرکنے لگی تھی۔

"آخری بار تم سے پوچھ رہا ہوں کہ بتا دو کہ اسلحہ کس جگہ دفن ہے! صحیح جواب نہ دوگے تو پھر یہ چھڑی تیرے اندر ہوگی۔"

کاٹھ کے آدمی کی دھمکی، چھڑی کی نوک کے سہارے، خوف کا علم بن گئی۔

"مجھے نہیں معلوم"... اسے یاد آیا یہ یاد بے بسی کا جسم اوڑھ کر، اس کے ہونٹوں تک آئی۔

"ہوں... تو مجھے معلوم ہے کہ اسلحہ دفن کیا گیا ہے لیکن تجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں دفن ہے یہی نا!" کاٹھ کے آدمی نے بے بسی کا راستہ روک لیا۔

"نہیں... ہاں ... نہیں مجھے کچھ معلوم نہیں" الجھنوں نے اس کے ذہن اور اس کے ہونٹوں کے درمیان فاصلے پیدا کر دیئے تھے اس نے بے بسی سے اپنی آنکھیں موند لیں۔

" اچھا یہ بتا دو کہ اسلحہ لایا کون تھا"! کاٹھ کے آدمی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے نئے سوال کا دھواں اس کی طرف پھینکا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں، لیکن ان میں کوئی جواب نہ تھا۔

" بھلا جیپ کس کی تھی؟"

" مجھے معلوم نہیں ..." اس نے اپنے آپ کو بتایا۔

" اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلحہ جیپ میں بھر کر لایا گیا تھا، لیکن تمھیں یہ معلوم نہیں کہ جیپ کس

کی تھی؟"

الجھنوں کا دھواں اس کے چاروں اطراف پھیلنے لگا۔ "اطہ۔۔۔ جیپ۔۔۔۔ معلوم، مجھے کچھ نہیں معلوم۔۔۔" الجھنوں نے پھر بے بسی میں پناہ لی۔

"تم شرافت سے نہیں سمجھو گے۔۔۔"

اس کی دھمکی کا کوئی جسم نہیں تھا اور کسی خالی غبارے کی طرح اس کے اوپر گھومنے لگی اس نے اس غبارے کو کوئی جسم دینا چاہا، مکوں، چانٹوں، لاتوں اور بالآخر بید کی چھڑی کا جسم فی الحال اس کے شعور اور احساس میں اس غبارے کا یہی جسم ممکن ہو سکتا تھا۔ اس نے دیکھے بغیر اپنی آنکھیں کاٹھ جیسے آدمی کی طرف موڑ دیں نہ دیکھنے کے باوجود کاٹھ کے آدمی کے ہونٹوں میں سلگتے ہوئے سگریٹ کا شعلہ اس کی آنکھوں میں در آیا اس نے اپنی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن ابھی اس کی پلکیں گری بھی نہ تھیں کہ اچانک خود بخود جبراً کھل گئیں اس کے ساتھ ساتھ اس کے جسم میں ایک زلزلہ آیا اور تمام دفاعی بند دوں کو بہا کر لے گیا۔ اس کے سینے کے بال سگریٹ کے شعلے اردگرد گھنڈیاں بن کر جلتی جھلستی جلد کے دھوئیں میں بھاپ بن گئے۔ اپنی ہی جلد کے جلنے کی بو کو وہ پہچان نہ سکا البتہ بالوں میں اٹھنے والی جلتی ہوئی اون کی بو اسے یوں لگی جیسے یہ بو اس کے سوجے ہوئے زخمی، نیل پڑے ہوئے پیروں سے اٹھ رہی تھی اور اس کے نتھنوں تک پہنچتے پہنچتے اس کے سینے پر گھڑی بھر کے لئے رک گئی تھی اور پھر اسی جلتی اون کی بو نے اسے اس انگارے کا احساس دلایا جو اس کی دونوں بھنوؤں کے درمیان دہک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کناروں میں پانی بھر آیا اور بے ساختہ از خود ابل کر اس کی کنپٹیوں میں بہنے لگا۔ کیوں؟ ۔۔۔۔ اسے بھی اپنی ضد پر قائم رہو گے" کاٹھ کے آدمی کی آواز بھنوؤں کے درمیان رکھے ہوئے انگارے کے اندگرد ہوا کا جھونکا بن گئی وہ چپ۔ اس کی آنکھیں چپ، لیکن اس کے کانوں کی سماعت کچھ اور بھی تیز ہو گئی تھی اس نے پھر ایک نئے سگریٹ اور ماچس کی نئی تیلی رگڑتے کی آواز سنی اس کے دونوں بغلوں میں الاؤ جل اٹھے اس کے دونوں چڈوں میں انگیٹھیاں دہکنے لگیں اور پھر اس کے کندھوں اس کے گھٹنوں اور اس کے پیٹ کی تہوں میں زلزلے آتے رہے آگ کی بھٹیاں جلتی رہیں آتشدان دہکتے رہے اب اس کی آنکھوں کے بجائے اس کا جسم رونے لگا، کیونکہ ہر نئے آتش فشاں کے پھٹنے کے بعد اس کی آنکھیں زور سے بھینچ جاتی تھیں اس کا نچلا ہونٹ جیسے اس کے دانتوں کا اضافی حصہ بن گیا

اور پھر اس کے پیٹ کے اندر ایک بھونچال آیا، اور اس کے منہ سے جھاگ اور پیلا زہر ابل کر اس کی باچھوں کے کناروں سے بہنے لگا اس لمحے کے بہت دور زلزلوں سے پرے ایک سرگوشی کی بھنک اس کے کانوں میں پڑی۔

"شاید بے ہوش ہو گیا ہے پانی ڈال کر اسے ہوش میں لاؤ" جب اسکی آنکھیں دوبارہ کھلیں تو ایک کاٹھ کے آدمی کے بجائے کئی ایک کاٹھ کے آدمی دکھائی دیئے جو پرچھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اور ان کے ہونٹوں میں آگ کے سرخ تتیے چمٹے ہوئے تھے ذرا سی دیر کے بعد یہ تمام آدمی پھر ایک کاٹھ کے آدمی میں بدل گئے لیکن اس کاٹھ کے آدمی کے بے شمار ہونٹ تھے جو ایک لمبی قطار میں اس کی آنکھوں تک پھیلے ہوئے تھے ان تمام ہونٹوں میں ایک ہی سگریٹ سلگ رہا تھا۔ لیکن اس کے ایک سگریٹ میں بے شمار شعلے تھے جو اس کی آنکھوں کی پتلیوں سے ناچنے لگے۔

"اب رہنے دو ... ہوش میں آگیا ہے ... یہ مرد بڑے سخت جان ہوتے ہیں" اس نے کاٹھ کے آدمی کی آواز پہلے آہستہ اور پھر بلند ہوتی ہوئی سنی "اسے پانی دے دو ..."

پانی ... اس کے ہونٹ پانی کا خیال آتے ہی پھڑپھڑانے لگے۔ اس کی زبان کے صحرا میں ببول کے کانٹے اگنے لگے زبان تالو میں کچھ تلاش کرنے لگی لیکن وہاں تو صرف کانٹے ہی کانٹے تھے۔ اس نے گلاس میں پانی انڈیلنے کی آواز سنی اور اس آواز سے اس کے حلق میں بھی ہو بہو ویسی آواز پیدا ہونے لگی۔ پانی ... کیا ذائقہ ہوتا ہے پانی میں ...! اس کا دل گلاس میں اٹک گیا جس میں پانی تھا ..

"لو یہ پانی پی لو ...!" کسی نے اسے مخاطب کیا"

لیکن کیسا پانی تھا۔ جس کے قریب آنے پر اس کی ساری آنتیں باہر آنے لگیں اس نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹ اور زور سے بھینچ دیئے اور اپنی آنکھیں بھی اور زور سے بھینچ لیں اسکے باوجود پانی اس کے نزدیک تر تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا رہا اس نے اپنی گردن کو جھٹکے سے دور ہٹا کر اس ..... اجنبی نزدیک پن سے بچنے کی کوشش کی گلاس اس کے ہونٹوں کے بند دروازوں کو توڑنے کی کوشش میں اس کی داڑھی اور گردن پر چھلک پڑا۔ اس کی آنتیں اس کے منہ تک آگئیں اسے اپنی برہنگی کا از سر نو احساس ہوا اور یخ کی ٹھنڈی سرد لکڑی اس کی برہنگی کا ایک انگ بن گئی جیسے اب اس

کی برہنگی اس ٹھنڈی گیلی لکڑی کی بنی ہوئی تھی لسے پیشاب نے کا خیال آیا یہ خیال آتے ہی اسے پھر گلاس یاد آیا اور اسے ایک ہچکی آئی اور اس کی آنتیں اس کے حلق میں پھنس گئیں ۔

" اسے ... اب بھی باز آجا ... بے وقوف کی ... کیوں خود کو مفت میں مروا رہے ہو ... صرف اتنا بتا دو کہ اسلحہ کہاں دفن ہے ، تو تمہیں چھوڑ دیں گے ۔"

ایک لمبی سانس اس کے پیٹ کی تہوں میں درخت بن گئی ۔ وہ اس درخت سے ڈرنے لگا اس درخت کے طوفانوں نے اس کی آنکھوں کے پٹ کھول دیئے اور کاٹھ کا آدمی ان کھلے پٹوں کے اندر آدھمکا ۔

" شاباش ... شاباش ... بتادو ... خواہ مخواہ دوسروں کے لئے اپنے آپ کو کیوں مرواتے ہو؟"

یہ "دوسرے" کون تھے ؟ اس نے سوچا ، لیکن یہ سوچ آتے ہی اس کی آنکھوں کے پٹ پھر بند ہو ہوگئے وہ بڑبڑایا : " دوسرے " ؟!

" ہاں ہاں ... دوسرے جو تمہارے ساتھ تھے "

" میرے ساتھ ... دوسرے بھی تھے ؟ کون تھے وہ ... ؟" اسکی بند آنکھوں کی پلکوں میں کچھ سائے لرزنے لگے ۔

" اسے ... کی اولاد ، یہی تو تم سے پوچھ رہے تھے ! کاٹھ کے آدمی نے اس کے برہنگی کو بید کی چھڑی کا احساس دلایا ۔ اس کی پلکیں تھرتھرائیں ، سانس اس کے حلق میں ذرا دیر کے لئے رک گئی اور جب بید کی چھڑی اوپر اٹھی ، تو اس کے نتھنوں سے فوارے کی طرح باہر نکل گئی ۔

" یہ اس طرح نہیں مانے گا ... ذرا مجھے وہ پلاس پکڑانا ... نہیں نہیں نہیں یہ نہیں زنبور ... "

یہ الفاظ اس کے کانوں اور اس کی آنکھوں نے بالکل نہیں سمجھے ۔ نامعلوم کیوں اسے اپنی برہنگی پھر یاد آگئی اور کوئی نیا خوف گانٹھ بن کر اس کے حلق میں تلملانے لگا ۔ اس کی بھٹنیوں ، بغلوں اور چڈوں میں خوف کے اُبلے از سر نو دھم دھم کرنے لگے ۔

جب اس کے پہلے انگوٹھے کا ناخن اپنے گوشت سے الگ ہو کر زنبور کے لوہے کا رنگ اختیار کرنے لگا تب اس کی کنپٹیوں ، کانوں اور آنکھوں کی پتلیوں میں پہلی مرتبہ یہ سوال درد کی ٹیس بن کر ابھرا کہ میرے ساتھ "دوسرے" کون تھے ؟ یہ "دوسرے" اس سے باہر تھے ۔ لیکن اس نے افسوس کیا کہ یہ "دوسرے" اب اسکے وجود میں سما گئے تھے اور اب اس کے ساتھ ہی تڑپ چیخ رہے تھے لیکن اس تڑپ اور چیخنے کی آواز اس سے بہت

دور تھی۔ یہ آواز اتنی ہی زندہ تھی جتنا وہ خود زندہ تھا جتنے اس سے باہر "دوسرے" زندہ تھے۔ لیکن پھر زنبور اس کی انگشتِ شہادت کے ناخن میں چمٹ گئی تو وہ آواز مر گئی۔ جب زنبور کھینچا گیا، تو اس کے دانت بڑبڑائے

"دوسرے... میرے... ساتھ... تھے..."

"کون تھے وہ؟" زنبور اس کی چھوٹی انگلی میں چپک گیا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ اس کی چھوٹی انگلی تھی یا شہادت کی انگلی تھی یا کوئی اور.... اس کی آنکھوں کی پتلیوں کے پیچھے انگلیاں ... ننگی ناخنوں کے بغیر انگلیاں کھمبیوں کی طرح اس کی آنکھوں کی پتلی زمین کو چیر کر رقص کرنے لگیں۔ ان انگلیوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ لیکن کھمبیوں کے پھول، خون آلود ہونے کی وجہ سے اس کی پتلیوں کے سیاہی مائل بھورے رنگ میں سُرخ پھندنوں کی طرح ٹنگے ہوئے تھے اس کی پتلیوں کے یہ سیاہ و سرخ، سرخ و سیاہ پھندنے پپوٹوں سے باہر بکھر گئے۔

"اس کی تو آنکھیں پتھرا گئی ہیں ..... دیکھو تو کہیں سالا مر تو نہیں گیا ...؟" کاٹھ کے آدمی کی آواز اس کی پیشانی پر پسینے کے قطروں کو برف کی مانند منجمد کر گئی۔

جب یہ برف پگھلی اور اس کے جبڑوں میں جنبش پیدا ہوئی تب اس کے کانوں میں کاٹھ کے آدمی کی آواز آئی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اسے دوسروں کے متعلق کچھ پتہ نہیں ...!"

"اسے دوسروں کا پتہ ہو یا نہ ہو لیکن اُسے یہ ضرور معلوم ہے کہ اسلحہ کہاں چھُپا ہوا ہے۔" یہ آواز نئی تھی۔ بھاری تھی۔ بے سمت تھی۔ غیر جانبدار تھی اور ہر جذبے سے خالی تھی۔

"لیکن اس کا اعتراف نہیں کرے گا" اب کے کاٹھ کے آدمی کی آواز میں بیزاری تھی تھکن تھی۔

"اعتراف تو اس کا باوا بھی کرے گا۔" یہ آواز اب بھی غیر جانبدار تھی۔ ہر جذبے سے خالی تھی، بے درد تھی، بے سمت تھی۔

"آپ خود دیکھیں ہم نے تو ہر طریقہ آزما کر دیکھا ہے ... اب تو اس کے جسم کا کوئی عضو بھی سلامت نہیں اس کے باوجود۔"

"ہوں ... اور عورتیں؟" اس سوال میں پہلی بار کوئی جذبہ تھا۔ ایک جانبداری تھی۔

"جی ہاں ... یہ نسخہ بھی آزما کر دیکھ لیا اس کی بیوی، اس کی بہن ... اور ہاں بڑھیا بھی ..."

اس کی ماں تھی شاید ... ان میں سے ایک حاملہ تھی ... پورے مہینے ... اس کی بیوی یا اس کی بہن ... یاد نہیں آتا ...، کاٹھ کا آدمی ہنسا لیکن اس ہنسی میں بھی بیزاری تھی، تھکاوٹ تھی، سیدھی سادھی ہنسی، جس کی کوئی ابتدا نہیں ہوتی جس کی کوئی انتہا بھی نہیں ہوا کرتی - بے مقصد، بے اطمینان ہنسی -

"اب کہاں ہیں ... ؟" نئی آواز میں اب کے سختی آگئی - درشتی پیدا ہو گئی -

"ہم نے انہیں چھوڑ دیا ... صبح ہونے سے پہلے، مبادا ..." کچھ بولیں ... ؟ اس سوال میں ایک سے زیادہ معنی تھی، یا ایک ہی معنی کے دو سوال تھے -

"ہاں ... نہیں،" کاٹھ کے آدمی نے مختصر جواب دیا - اس جواب میں سب معنی شامل تھے

"اور یہ ... ؟" یہ سوال اتنا مختصر نہ تھا -

"یہ ... ہاں، یہ تو تقریباً پاگل ہو گیا تھا بڑے واسطے دیئے ... بڑی التجائیں کیں ... پھر دھاڑیں مار کے رونے لگا سر گھٹنوں میں چھپا کر کافی دیر سسکتا رہا، بلکتا ..." کاٹھ کا آدمی کوشش کے باوجود مختصر سا جواب دینے میں کامیاب نہ ہو سکا -

"اس کے بعد بھی کچھ بتانے پر تیار نہیں ہوا ؟" یہ سوال استفسار ہونے کے باوصف جیسے کاٹھ کے آدمی کے جملے کا آخری حصہ تھا جس کے بغیر بات نامکمل تھی -

"ہاں .... نہیں،" کاٹھ کا آدمی پھر الجھن میں گرفتار ہو گیا -

"اور اس کے ساتھی .... ؟" نئی آواز کی سختی میں قدرے نرمی آگئی -

"تین آدمی دو بدو فائرنگ میں مارے گئے، باقی ایک آدمی جو زخمی ہوا تھا، سو وہ بھی اسپتال میں مر گیا ..." کاٹھ کے آدمی نے چھڑی میز پر اس طرح رکھ دی جیسے اب چھڑی بھی مر گئی ہو اور جس سے اب اس کا کوئی واسطہ نہ تھا -

"اور ہمارے آدمی ... ؟" یہ سوال آتنا آہستہ پوچھا گیا کہ کاٹھ کے آدمی نے جیسے اس کی تصدیق کی خاطر، مردہ چھڑی اپنے ہاتھ میں لے لی دوسرے ہاتھ پر چھڑی کی ضرب لگاتے ہوئے اس نے کہا -

"پہلی رپورٹ کے مطابق سات ... تازہ رپورٹ کے مطابق آٹھ !"

"وہ کیسے ؟"

"آٹھواں آدمی ان میں سے تھا ... اس نے اپنی رائفل اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر گھوڑا دبا دیا تھا

.... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب گاؤں پر حملہ ہوا تو اس نے فائر کھولنے سے انکار کر دیا اور ناچار اسے شوٹ کرنا پڑا۔ اس کی لاش اناج کے کھلیان کے پیچھے ملی تھی..." یہ سن کر اس کا بدن تن گیا اور بیک وقت کئی خیال آئے کاٹھ کا آدمی خاکی ڈریس کا مستطیل بن گیا۔ آسمان کے مثلث میں بے شمار تارے جگمگانے لگے روشنی کی تصویر میں دھنک کے رنگ بھرنے لگے اور اس ہفت رنگ احاطے میں میں اسے "آٹھواں آدمی" نظر آیا جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ ایک آس تبسم بن کر اس کے گھائل ہونٹوں کے آبلوں میں پھیل گئی اور اس نے اپنی پوری طاقت آخری سانسوں میں مجتمع کرتے ہوئے کہا
"میں تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا"

بختاور

رسول بخش پلیجو

جس وقت ٹیلیگرام آیا۔ میں شیو کر رہا تھا۔ کریم لگے ہوئے منہ سے ہی ٹیلیگرام والے سے ٹیلیگرام لیا اور اس کو دستخط دے کر بائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی ریزر (جو بےخیالی میں ساتھ لے گیا تھا) میز پر رکھ کر لفافہ کھولا، ٹیلیگرام پڑھا اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا وہ کانپ نہیں رہے تھے۔ آئینے میں چہرہ دیکھا کریم لگے ہونے کے باوجود محسوس ہوا کہ اس پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ اب سارا دھیان شیو کرنے میں لگا دیا۔

گھڑی دیکھی سوا دو بجے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ سندھ ایکسپریس میں ابھی پون گھنٹہ ہے۔

"کریما"

"جی ابو"

"بیٹا میرا بیگ تیار کر دو، مجھے باہر جانا ہے!"

کریما ایسے کاموں کی عادی ہو گئی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں اسٹیشن پر پہنچ گیا بلکہ ہم پہنچ گئے۔ کیونکہ کریما بھی میرے ساتھ تھی گاڑی میں بیٹھے۔ ڈیڑھ۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد اسٹیشن آ گیا۔

سول ہسپتال کے دروازے پر پہنچتے ہی کریما کو کہا۔ "میں تمھیں بالکل نہیں لا رہا تھا لیکن تم بھیڑہ کر کے زبردستی چلی آئیں۔ ٹھیک۔؟"

"جی ابو"

"تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے"؟

"جی ابو"

وہ دروازے سے تیسرے نمبر بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ گاؤں کے پانچ چھ مرد عورتیں اس کے قریب بیٹھے اور کھڑے ہوئے تھے۔ بیٹھے ہوئے بھی ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

"کبھی کبھی ہوش میں آتی ہے ورنہ ایسے ہی غشی میں پڑی رہتی ہے۔ دو گولیاں نکالی ہیں۔ ایک ران سے دوسری کندھے سے"

"بیچارے ڈاکٹر لوگ رات دن دو پاؤں پر کھڑے ہیں۔ شاباش ہے ان کو۔ دو گھنٹے کے آپریشن کے بعد کہیں جا کر گولیاں نکلی ہیں۔ ..."

مڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر اللہ رکھا کہہ رہا تھا" ہم نے پوری کوشش کی ہے۔ باقی تو خدا کا اختیار ہے... خوش قسمت ہے کہ بروقت ہی فرسٹ ایڈ مل گئی اور خون حد سے زیادہ نہیں گیا۔ ورنہ وہیں ختم ہو جاتی ران والی گولی بھی خوش قسمتی سے گوشت کے باہر کے حصے میں لگی ہے۔ کندھے کے پاس ہڈی میں فریکچر ہوا ہے۔ ہڈی دو حصوں میں ٹوٹی ہے۔ جوڑ دیا ہے خدا کرے گا مل جائے گی۔ یہ گولی ذرا سا اِدھر اُدھر لگتی تو بہت نقصان دیتی۔ شاید بازو کاٹنا پڑتا ... پھر بھی دیکھو خدا کرے کوئی اور کمپلیکیشن نہ ہو۔ ویسے تو صحتمند اور جوان ہے اگر کوئی اور کمپلیکیشن نہ ہوئی تو ہم بہت پُر امید ہیں۔"

ایسے میں کریما نے پکارا، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔" کہتے ہیں" او" گروپ کا خون چاہیئے ہوگا۔ میرا گروپ بھی "او" ہے، جب امی ہسپتال میں داخل تھیں اور خون چاہیئے تھا تو میں نے ٹسٹ کروایا تھا۔"

کریما جب خون دے کر فارغ ہوئی تو ہم سائیں بخش کے گھر چلے گئے جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ شام کو پھر ہسپتال آئے وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے دیکھنے کیلئے اپنی ساری جذباتی اور ذہنی ہمت بحال کی۔ اس کے گلاب کے پھول جیسے چہرے پر نیلاہٹ چھا گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اس کے ہمیشہ کھلتے ہونٹ کالے پڑ گئے تھے۔

جیسے زندگی اور موت کے درمیان عالمی جنگ جاری تھی۔ میں نے کریما کیطرف دیکھا۔ وہ بالکل

خاموش تھی۔ البتہ آنسو تھے جو آنکھوں سے لڑیوں کی صورت رواں تھے۔ میں نے سوچا۔ یہ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں تھی، اپنے کسی پیارے کو زندگی اور موت کی کشمکش میں پاکر اگر آنسو بہہ نکلے تو اس میں کسی کا کیا دوش!! بنیادی شرط یہ ہے کہ ہمیں بین نہیں کرنا جو کہ وہ نہیں کر رہی تھی۔ باقی گونگے آنسوؤں سے کیا۔؟

کریما نے آہستہ آہستہ چپکے ہی چپ میں اس کے قریبی رشتہ داروں سے بھی آگے نکل کر اس کے سرہانے بستر پر قبضہ کر لیا تھا۔ دوسری رات وہ ہسپتال ہی میں رہی تھی۔ صبح گیا تو ساری رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سُوج کے سرخ ہو گئی تھیں۔ مجھے کریما کی اس حالت پر رحم بھی آرہا تھا لیکن اس سے زیادہ خوشی ہو رہی تھی۔ رضیہ، صفیہ حتیٰ کہ اس کی ماں کا بھی ویسے ہی مجھ پر الزام ہوتا ہے کہ میں کریما کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اور میں نے لاڈ کر کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے تینوں بیٹیاں ایک سی ہی پیاری ہیں۔ کریما نے زبردستی اپنے آپ کو اگر معتبر بنا دیا ہے تو اسے کیا کیا جائے۔؟ بی۔ اے فائنل میں ہے پڑھائی میں سب سے تیز، ہمیشہ فرسٹ آتی ہے دوسری طرف انہی خواتین کی انقلابی وطن دوست تنظیم میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتی ہے اور اس سلسلے میں پورے سندھ کے گاؤں اور شہروں کے دوروں پر بھی جاتی ہے اخبار، رسائل میں پڑھ کر بحث و مباحثے بھی کرے۔ سارا دن پوچھ پوچھ بھی لگاتے رہے سب کو نصیحتیں بھی کرتی رہے گی۔ منجھلی ہونے کے باوجود سب کی بڑی اماں بنی بیٹھی ہوتی ہے۔ میرے بلانے پر بھی بھاگی آئے گی، نقلیں بھی اتارے گی بڑے بڑے قہقہے لگائے گی، ہنسے گی بھی ہنسائے گی بھی وطن، عوام، تیسری دنیا، سامراج اور بدامنی عالمی صورتحال پر تشویش بھی سب سے زیادہ اسی کو ہو گی۔ گھر میں بھی تنقید اور خود تنقید کی بیٹھکیں بلاتی رہے گی۔

اگر میری کوئی بات پسند نہیں آئے گی تو ناراض ہونے کی بجائے کہے گی "ابو۔ میری آپ پر تنقید ہے فارغ ہوں تو بتانا میٹنگ کریں گے۔" اس کی کاپی میں بہت سارے اقوال لکھے ہوتے ہیں مثلاً "مطالعہ۔ تنظیم۔ جدوجہد" "عمل نظریہ بنا اندھا اور نظریہ عمل بنا بانجھ ہوتا ہے" "تنظیم جدوجہد کے لئے، جدوجہد تنظیم کے لئے" "سادہ رہن سہن اور کٹھن جدوجہد" "وقت کی پابندی اور رازداری" "مزاجیت کے خلاف جدوجہد کرو" وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن پوچھنے لگی "ابّو! جُوینل کون تھا۔؟" میں نے کہا "جُوینل یا جوینال روم کے شاعر تھے۔ آج سے صرف ۱۹ صدیاں پہلے کا، کیوں؟ جوینل کو کیا ہوا ہے؟"

کہا "میں نے پڑھا ہے کہ وہ اس وقت کے ظالموں کے مکر و فریب اور ظلم کے خلاف شعر لکھتا تھا۔" میں نے کہا "بالکل یہ اسی ہی کا قول ہے کہ ناراضگی شعر لکھواتی ہے"۔

ایک دن میں شیو کر رہا تھا تو باہر ہی سے چیخ کر بولی، "ابو! کسی سے لڑ رہے ہو؟"

میں چونک گیا "جی بیٹا؟"

"ابّو کس سے لڑ رہے تھے۔؟"

"کسی سے بھی نہیں"۔

"یہ جو کہہ رہے تھے۔ انسان بنو۔ انسان بنو یہ کس سے کہہ رہے تھے؟"

"اچھا اوہ ۔۔۔ وہ تو میں اس مکھی کو کہہ رہا تھا۔ بار بار آکر ڈسٹرب کرتی ہے شیو ہی نہیں کرنے دے رہی۔"

اس کے پیچھے اس کا چھوٹا بھائی اصغر دوڑتا ہوا آیا۔ آتے ہی کہنے لگا۔

"ابو آپ کو بتاؤں کریما اتنی خوش کیوں ہے۔؟"

میرے پوچھنے سے پہلے ہی بے چینی سے کہنے لگا

"کیونکہ آج اس کی سہیلی بختاور آرہی ہے ہمارے گھر میں۔؟"

بختاور کا نام میں کریما اور دوسروں کی زبانی بہت سن چکا تھا۔ وہ عورتوں کی تنظیم کی اعلیٰ رکن، سننے میں آرہی تھی۔ اس کی ہمت، اور جانی، محنت اور جفاکشی کے ساتھ اس کے شعور، قابلیت اور تقریر اور تحریر دونوں کی بڑی تعریف سنی تھی۔ کریما نے اس کے کچھ خطوط بھی مجھے پڑھائے تھے۔ جن سے اس کے جوش، جذبہ، سادگی، خلوص، اعلیٰ اصولوں اور آدرش کا پتہ لگ چکا تھا۔ سنا تھا کیٹی بندر سے کشمور اور کراچی سے کارو نجھر تک عورتوں کو منظم کرنے میں بہت فاصلے طے کئے ہیں سوچا اچھی بات ہے۔ ایک کارکن اور ساتھی سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقعہ ملے گا۔ اتنے میں پیچھے سے کریما کی ماں آکر برسنے لگی۔

"اپنی چہیتی کو سمجھاتے نہیں۔؟ نہ صلاح نہ مشورہ۔ دعوتیں کرتی پھرتی ہے۔ مہمان بلوائے ہیں

گھر میں نہ عزت کے لائق بیٹھنے کی جگہ نہ کوئی دیکھنے کے قابل گھر۔ میاں بیوی آئیں گے تو رہیں گے کہاں۔؟"

"ابو میں بتاؤں۔" اصغر نے کہا "بیوی گھر میں، میاں اوطاق میں"

اس کی امی نے ناراض ہو کر کہا "تم تو بیچ میں مت بولو۔"

(۲)

بہار کا موسم آچکا تھا۔ آنگن میں گلاب اور موتیہ کے پودوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ آسمان پہ دور دور چیلیں گشت کر رہی تھیں۔ میں کسی سوچ میں گم تھا کہ اتنے میں کریما نے آکر کہا "ابو! کوئی اخباری نمائندہ آپ کا انٹرویو لینے آیا ہے۔" اس کے ساتھ رنگ برنگی شیشوں لگی ٹوپی پہنے ایک بچہ اس کی انگلی پکڑے میرے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ کریما نے نہیں بتایا کہ وہ بچہ کس کا تھا۔ البتہ اتنا کہا کہ "اب آپ خود ہی اپنا اپنا تعارف کروائیں"

میں نے یکدم لڑکے کو کہا "میں تمہاری ماسی کریما کا ابو نور محمد وکیل ہوں اور آپ مائی بختاور کے بیٹے ہیں۔"

لڑکے نے مسکرا کر ہاں کی۔

پہیلی بوجھ لی تو کریما کچھ حیران ہوگئی۔ شور مچا کر کہنے لگی "ابو یہ چیٹنگ ہے ... یہ چیٹنگ ہے ... آپ کو اس بے ایمان اصغر نے پہلے ہی بتا دیا ہوگا۔"

"نہیں ... نہیں اللہ قسم، میں نے نہیں بتایا۔" اصغر نے چیخ کر کہا۔ "ان کو گھر میں آتے وقت ابو نے دیکھ لیا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں بتاؤں۔؟ میں آپ سب لوگوں کی بے چینی سے سمجھ گیا کہ یہ مہمان وہی ہوں گے جن کی میزبانی کے شرف کیلئے تمہاری ماں اتنی خوش دلی سے انتظار کر رہی تھی۔"

دونوں بھائی بہن ہنس دیئے۔

اتنے میں ایک عورت تیزی سے اندر آئی اور آتے ہی میرے پاؤں چھو کے ہاتھ ملایا، میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے پیار سے کہا "بختاور بیٹا! خوش آمدید"

جب سر اونچا کر کے کہنے لگی "ابا! تم تو خوش باش ہو نہ؟" تو میں متعجب رہ گیا۔ ایک جانی

پہچانی لڑکی کو بختاور کے روپ میں دیکھ کر حیرت میں آگیا۔ وہ اپنی ساری بے انت خوب صورتی، بے باکی اور ذیا سے، بے پناہ قرب اور اپنائیت سے بھرپور میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں اسے بوکھلائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار پوچھنے لگا۔ "لیکن تم یہاں کیسے؟ کریا کو کیسے جانتی ہو۔؟"

کریا نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔ "لیکن جناب ابو صاحب! معاف کیجئے گا پہلے آپ بتائیں کہ آپ بختاور کو کیسے جانتے ہیں اور کب سے۔؟ میں دو سالوں سے بختاور۔ بختاور کرتی چلی آرہی ہوں۔ اتنے سارے خطوط لکھے اور آپ کو بھی پڑھائے لیکن آپ نے کبھی نہیں کہا کہ آپ بختاور کو جانتے ہیں۔"

کہا۔ "لیکن بختاور کو جانتا بھی کون ہے۔؟ وہ ہے کہاں؟ آنے والی تو وہ ہی تھی نہ"
اتنے میں بیوی جی اندر آئیں اور کہنے لگیں "چلو بیٹیو! کھانا تیار ہے۔ اصغر تم یہاں آؤ اوطاق میں کھانا دے آؤ" اور وہ یہ کہتے ہوئے ساروں کو ساتھ والے کمرے میں لے گئیں۔ ایک منٹ کے بعد وہ مہمان واپس آئی اور کہا "لیکن اباجی وکیل صاحب۔ لوگوں کے تنظیمی نام بھی تو ہوتے ہیں کہ نہیں۔؟ تنظیمی ساتھیوں کے پاس میں بختاور ہوں، ویسے بھی دونوں ناموں کے معنیٰ تو ایک ہی ہیں۔ لیکن وہ نام ماں باپ نے رکھا تھا اور یہ نام میں نے خود اپنے آپ پر رکھا ہے سمجھ اور شعور حاصل کرنے کے بعد آیا خیال شریف میں؟" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

میں دنگ رہ گیا۔ بختاور کے روپ میں اس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اور وہ بھی اتفاق سے اپنے ہی گھر۔ حیدرآباد میں ہوئی تھی۔

... * ...

شام کے بعد کریا کو ہسپتال میں چھوڑ کر میں سائیں بخش کے گھر چلا آیا اور آنگن میں پڑی چارپائی پر لیٹ گیا۔

خزاں کی ہواؤں نے پت جھڑ شروع کر دی تھی کھلے اور صاف آسمان پر چاند اپنے پورے شباب سے کھڑا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آوارہ بدلی پتہ نہیں کہاں سے بھٹکتی ہوئی آتی اور چاندنی سے آنکھ مچولی کھیل کے آگے نکل جاتی۔ میں نیند کی بجائے خیالوں اور سوچوں کی دنیا میں گم ہو گیا۔

ایک ایک کرکے سارے واقعات یاد آتے گئے۔

ان دنوں میں سینٹرل جیل میں تھا۔

ایک تو پہلے ہی ملک کے رکھوالوں کو نہیں بھاتے تھے اوپر سے جو جیل میں ہڑتال ہوئی تو اور بگڑ کے اس جیل سے نکال کر ایک ایک دو دو کرکے مختلف جیلوں کو بھیج دیا۔ مجھے اور کرم علی شاہ کو سینٹرل جیل بھیج دیا جیل ویسے ہی جیل ہوتی ہے لیکن یہ جیل خدا کی قدرت ہے پتھر کے ٹیلوں پر بنایا گیا تھا جیسے جیسے سورج چڑھتا اور دن تپتا ویسے ویسے پتھر سے دھواں اٹھنے لگتا۔ دھرتی تپ کر تانبہ بن جاتی لوگوں کے جسم پک کر چھالے چھالے ہو جاتے۔ جو اس زمین کے عادی تھے وہ تو جیسے تیسے کرکے گذار لیتے تھے باقی جو اس زمین کے عادی نہیں تھے ان کے لیے توبہ تھی۔ میں ایک سال پہلے بھی یہاں رہ گیا تھا لیکن اس سال گرمی کچھ اور تھی۔ میں نے اس دفعہ اس جیل میں دیکھا کہ اپنے وارڈ کی نظرداری کرنے والے رحیم بخش کی گردن پر اتنے بڑے بڑے چھالے نکل آئے ہیں۔ ڈر گیا کہ کہیں چھوت کر ہمیں بھی نہ لگ جائیں۔ ڈپٹی کو کہلوا بھیجا تو انہوں نے کہا "شام کو دوسرا آدمی بھیجیں گے۔"

واقعی شام کو دوسرا آدمی آگیا۔ قیدی۔ کپڑے بالکل میلے، قد کا چھوٹا بدن میں ٹھیک ٹھاک منہ پر چیچک کے نشان، رنگ کالا سا، کان بڑے بڑے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگا میرے سامنے کوئی بڑا اچھا کھڑا ہے چمڑی کی بیماری سے پاک لگ رہا تھا۔ سو میں سوچا بلیک اس کو میرے پاس رکھیں۔ نام عبدالجبار بتایا۔ بولتا آہستہ تھا۔ زبان اور لہجہ میٹھا میٹھا تھا۔ لیکن بے ساختہ پن بلکل نہیں تھا۔ لفظ سوچ سوچ کر چبا چبا کر بول رہا تھا۔ دیکھنے میں بہت غریب مسکین کپڑے پھٹے ہوئے لیکن جب بولتا تھا تو کچھ اور لگ رہا تھا۔

جیل بھی لوگوں کیلئے بنے ہیں۔ ہم بھی اپنے حال کے مطابق اس سے نبھاتے چلے آئے ہیں اور وہاں جو طرح طرح کی جنس آتی رہتی ہیں۔ اس سے بھی واقف ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن مجھے اس نئے جو اب دار میں کوئی نئی بات نظر آئی جو کسی اور قیدی میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ بات کیا تھی، کونسی تھی یہ سمجھ نہیں آرہا تھا لیکن کوئی بات تھی ضرور! مختلف سب

سے مختلف ہم سے کم میرے لئے گھُنہ پن - چالاکی - مکاری - شاید یہ بھی ... لیکن کچھ اور بھی ...
اور بھی کچھ ! جیسے ہر قیدی سے پوچھا جاتا ہے، اس سے بھی پوچھا

"کس میں آئے ہو ؟"

"گیرت میں"

"کس کو مارا ؟"

"بیوی کو"

"کسی اور کو بھی ساتھ میں - ؟"

"نہیں"

"سزا کتنی رہتی ہے" ؟

"بس جی ! نکلنے والے ہیں - آئی جی آنے والا ہے اس نے دو ماہ کی معافی دی، اور کوئی
اگر سیلاب وغیرہ کی بھی دو ماہ تک معافی ملی تو ہم باہر ہیں"

"کل کتنی سزا ملی تھی - ؟"

"ڈھائی سال، جس میں سے سال سوا سال کاٹی ہے اور کچھ معافی ہے، بس آپ کی دعاؤں سے باہر ہیں" "بہت
کم سزا ملی ہے قتل کے کیسوں میں عمر قید ملتی ہے" "بہت سارے پھانسی پر لٹک جاتے ہیں ایسے کیسوں میں"

"جناب ہم گریب لوگ وکیلوں شکیلوں سے کیا جانیں بس کورٹ میں داخل ہوتے
ہی جج صاحب کو عرض کی کہا جناب عالی! مسلمان ہو، تخت سلیمانی پر بیٹھے ہو، قلم تمہارے
ہاتھ میں ہے - بس تھوڑی سی گیرت کھائی ہے - تم سے کیا چھپانا، گیرت کے جرم کا مجرم ہوں -
بے گیرتی برداشت نہیں ہو سکی - خطا ہو گئی تمہیں جو انصاف سے سزا دینی ہے وہ دے دو - وہ بھی
آدمی تھا گیرتی اور انصاف والا، کہا - "چلو بیٹا ڈھائی سال"

اس نے یہ بات ایسے کہی جیسے قتل کی سزا کی نہیں - آٹے چاول کی بات ہو -

کچھ دن گذر گئے - ایک دن گرمی نے حد کر دی، شام کے وقت مجھے بخار ہو گیا - جیل کی ہسپتال
کے کمپاؤنڈر نے گولیاں دیں آدھی رات کو کھولیاں بند ہونے سے پہلے نیا جو اداز عبدالجبار میرے
پاس بیٹھ کر مجھے دبانے لگا - تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی خبریں کرنے کے بعد اپنا قصہ شروع کر دیا -

(ویسے بھی عام قیدی اپنی واردات کا قصہ ضرور سناتا ہے۔)

"کچے میں بیٹھے ہیں مسکین مارو لوگ ہیں۔ گھر میں دو چار گائیں ہیں۔ دو بیگھہ زمین بھی ہے۔ اس کے علاوہ ابا بھی پڑھا لکھا ہے۔ مسجد میں امامت کرتا ہے۔ شکر ہے۔ بھوک نہیں ہے۔ بابا کی بھی آس پاس کافی عزت ہے۔ بے غیرت کا دشمن ہے۔ کہتا ہے عورت کو چچا زاد خالہ زاد بھائی کا بھی منہ نہیں دیکھنا چاہیئے۔ ادھر چچا میرے بے غیرت چچا ہی کیا سارا گاؤں بے غیرت ہو رہا ہے، مرد ساتھ بیٹھے قہقہے لگاتے رہتے، گاؤں میں کھیل ہو رہے ہیں۔ کافیاں گائی جا رہی ہیں لڑکیاں لڑکے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ ساتھ والے اسکول میں مطلب کہ تماشہ لگا ہوا ہے۔ بابا نے کافی سمجھایا۔ لیکن ادھر بابا ایک ادھر بے غیرتوں کا سارا راج۔ بابا ناراض ہو کر گاؤں چھوڑ کر چلے گئے جا کر دوسری مسجد میں امامت کی۔ دو تین سال وہاں رہے۔ میرے چچا کی تین بیٹیاں اور ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ سب کو اسکول میں ڈال دیا۔ بیٹیاں بھی تو بیٹا بھی۔ دو تین سالوں میں بڑی بالغ ہو گئی اور آ کر میٹنگ (میٹرک) میں ہاتھ ڈالے۔ چھوٹی بھی آکر آٹھویں میں پہنچیں۔ بابا نے سوچا کہ اس نے اگر میٹنگ پاس کر لی تو کام ہاتھ سے چلا جائے گا سو ایک دن پھر واپس آ کر گاؤں میں بسے اور آتے ہی رشتہ کی بات کی۔ لیکن وہ کہیں کہ ہم کوئی اس ٹھکاری کو دیں گے۔ ہماری بیٹی لاکھوں میں ایک، یہ سارا دن جھگڑا جھگڑا کرتا پھر رہا ہے۔ سو اس کو ہم کوئی اپنی مول کی سی بیٹی دیں گے۔"

"لوگوں میں آج کل شرم تو آپ دیکھ رہے ہیں۔ کتا بچا ہے۔ دس دولہے تیار کھڑے تھے لڑکی بھی تھی اور گاؤں والوں سے افغانوں اور شکل شبہیہ میں بالا، اوپر سے پڑھی لکھی سو ہر کوئی اس کے لئے زور لگا رہا تھا۔ وہ بھی میرے بارے میں کہے کہ "میں تو اس کی کھال سے جوتی بھی نہیں بنواؤں" ہم نے بھی کہا مرتے مر جائیں گے حق نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے اعلان کر دیا جو کوئی ماں کا لال سر سے ہاتھ اٹھائے وہ آکر اس کے رشتہ کی دعویداری کرے۔ ادھر ابا نے بھی گاؤں کے سارے معززین کو اکٹھا کر کے راج بلوا لیا۔ ادھر میرے ہاتھ میں کلھاڑی۔

وہ بھوکے لوگ جو کچھ تھا وہ لڑکے لڑکیوں کی پڑھائی پر ختم کر دیا سو وقت کی روٹی کے

لئے بھی لاچار تھے۔ ہمارے پاس کچھ دانے تھے قصہ کوتاہ ہم سے پیر وڈیرے مولوی منشی اپنی طرف کر لئے۔ کچھ ڈور ڈنڈے کا بھی تھا۔ مجھے بھی سب جانتے تھے کہ باز نہیں آئے گا۔ سب رعب میں آگئے۔ رشتے کے طلب گار ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ انہوں نے بھی گردن پر چھری محسوس کر کے رشتہ دے دیا۔

میں نے شادی کرتے ہی نئی کلہاڑی دکھاتے ہوئے کہا، "یہ خاص طور پر تمہارے لئے ہے سارے اگلے پچھلے حساب ہوں گے ایک دن تمہیں اسی سے مرنا ہے۔ تیار رہنا، دوسری بات کہ میرے ابا کا کہا اگر ٹالا ہے تو ... اگر ابا کہے سارا دن کڑی دھوپ میں کھڑی رہو تو تمہیں کھڑا رہنا ہے۔ بے گیرت گھر پیچھے چھوڑ آئی ہو اب تمہیں یہاں سے ایک قدم باہر نہیں نکالنا۔"

پہلے دو چار عیدوں پر گھر جانے کیلئے چھوڑا پھر بند کر دیا کیا فائدہ؟ اس کا باپ آیا منہ اٹھائے عید پر لے جانے کیلئے۔ بے عزت کر کے واپس کر دیا۔

دیکھا کہ یہاں یہ بے گیرت ہر آئے دن چلے آئیں گے سو ہم یہ گاؤں ہی چھوڑ کر دوسری طرف چلے گئے اور شہر میں جا کر رہنے لگے۔ ابا شہر کی مسجد میں پیش امام ہو گیا۔ وقت اچھا گذر رہا تھا۔

میرا پڑوس میں کسی سے دل اٹک گیا۔ دو چار ماہ تو آرام اور خیر خوبی سے وقت گذر رہا تھا۔ لیکن ایک دن میرے یہاں سے واپس جاتے پکڑا گیا۔ اس کے شوہر نے سر منڈوا کر طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ روتی ہوئی میکے چلی گئی۔ سوچا چلو مولا کوئی اور دلوائے گا۔ کیا کیا جائے جناب! آپ تو توانا آدمی ہیں اپنی بیوی چاہے سونے کی ہی کیوں نہ ہو مرد کا دل ضرور چاہے گا کہ ذرا ذائقہ تبدیل ہونا چاہیئے، میری بیوی کی میرے آگے بولتی بند۔ آنکھوں سے دیکھتی رہتی تھی۔ ایک ڈانٹ پلاتا تھا تو کانپنے لگتی تھی۔ کہاں کا حسن، کہاں کا علم؟ میرے آگے سب کچھ ختم ہو جاتا۔

خدا کے حکم سے اس درمیان بیٹا ہوا۔ وہ بھی چار پانچ سال کا ہو گیا، ایک بیٹی تھی وہ بھی دو تین سال کی ہو گئی تھی۔

رمضان کی آخری تاریخیں تھیں۔ ایک دن اچانک گاؤں جانے کی الاپ شروع کردی "مجھے گھر والے یاد آرہے ہیں اس عید پر مجھے گاؤں لے چلو" آخر گھر میں مار پیٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے پہلے خسیس بات پر مار مار کے حلیہ بگاڑ لیتا تھا لیکن ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ ذرا سی لاٹھی ماری تو شور مچانا شروع کردیا۔ کلہاڑی دکھائی پھر بھی چُپ ہی نہ کرے۔ شہر کا ماحول سارا پڑوس اکٹھا ہوگیا۔ ابا نے خبر سنی تو اور ناراض ہو گئے کہا "تم سے ایک عورت نہیں سنبھلتی، اس خواری سے تو بہتر ہے کہ چھوڑ آ دو اسے میکے" پھر سوچا ذرا نرمی سے کام چلا کر دیکھوں۔ کہا " رحمت (اس کا نام رحمت تھا) بات سنو اس مرتبہ چھوڑ دو اگلی بکرعید پر تمھیں لے چلوں گا تمھارے اور بچوں کیلئے کپڑے سلواؤں، اس حال میں چلیں گے تو لوگ کیا کہیں گے؟" لیکن وہ کیوں مانتی؟ کہا "کچھ بھی ہو مجھے گھر والے یاد آرہے ہیں مجھ سے یہاں اب ایک پل بھی نہیں گذرے گا۔"

"اگر مارنا چاہتے ہو تو مار کر ختم کردو"

میں نے سوچا یہ قصہ اب زیادہ نہیں چل سکتا گیرت کا مسئلہ ہے یہ اگر ایسے ہی تجھ سے نکلنے لگی اور بے خوف ہوگئی تو گھر میں تو بیٹھے گی ہی نہیں چاہے کچھ بھی کیا جائے، اس نے جو اتنے سالوں کے بعد بے خوف ہوکر منہ کھولا ہے سو یہ مرنے مارنے کے بغیر نہیں رہے گی۔ اور بے گیرت ہوکر مرنا پڑ جائے گا۔

سو بالآخر لڑکی کو اٹھایا کندھے پر اور کہا چلو تیار ہو جاؤ تم جیتی میں ۔ ہمارا ستائیسواں روزہ تھا۔ شب قدر کا۔ بیٹے اور ابا کو گھر میں رہنے دیا اور ہم چل پڑے۔

بس کے ذریعے راستہ پندرہ سولہ میل کا ہوگا اور بیچ سے چھ سات میل کا، کہا غریب لوگ ہیں کرایہ بھی بچ جائے گا اور جلد بھی پہنچیں گے۔ بچوں بیچ پیدل چلتے ہیں۔

وہ تو بیس کوس چلنے کو تیار تھی۔ کھل کے پھول بن گئی منٹوں میں تیار ہوگئی۔ کپڑوں کی ایک گٹھڑی اٹھائی۔ راستہ میرا جانا ہوا تھا راستہ میں درمیان میں گھنا جنگل تھا۔ وہاں پہنچے تو دن بہت گرم ہو چکا تھا۔ کہا "کچھ دیر آرام کرکے ذرا سائے لیٹے ہوں تو پھر چلتے ہیں۔" کوئی بستی بشر نہیں تھا۔ ہم لیٹ گئے۔ بیٹی بھی سو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد جب

دیکھا کہ اس کی بھی آنکھ لگ گئی ہے تو میں نے جا کر اس کی گردن پر ہاتھ جما لئے۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ بہت زور لگایا لیکن مرد کے آگے ایک عورت کی کیا چلے گی۔ میں نے بھی بلا دیر سانس کی نلکی کو دبا دیا۔ بہت تڑپی، چھڑانے کی کوشش کی لیکن ایک لفظ بھی نہیں نکال سکی۔ آخر تڑپتے تڑپتے بے جان ہو گئی۔ جب یقین ہو گیا کہ اب ختم ہو گئی ہے تب اس کا گلا چھوڑا بیٹی کو اٹھا کر واپس شہر آنے لگا۔ تھوڑا سا چلنے کے بعد خیال آیا کہ اگر تھوڑی سی سانس بچ گئی ہو گی تو سیدھا پھانسی پر لٹکا دے گی۔ سو خاطری کرنے کے کیلئے واپس گیا۔

کیا دیکھوں کہ واقعی آنکھیں کھولے دیکھ رہی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں مجھے دیکھ کر سہم گئی۔ بولنے کی کوشش کی مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکال سکی۔ آہستہ آہستہ بازو اٹھا کر ہاتھ جوڑنے لگی، معافی مانگنے لگی۔ لیکن اب میں کہاں چھوڑتا۔ سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا کوئی آدھ گھنٹہ تک گلے کو دباتا رہا پھر بہت دیر تک منفی دیکھتا رہا جب یقین ہو گیا کہ اب بالکل ختم ہو گئی ہے تب چھوڑا، اور بیٹی کو گھر چھوڑ کر تھانے میں خود کو پیش کیا۔

ایک پولیس والے نے لڑکی لیکن تھانیدار صاحب نے کہا۔ بس کرو! غیرت والا ہے غیرت میں آیا ہے اسے کچھ نہ کہو پھر بہت عزت سے لاک اپ میں رکھا۔ اس درمیان بہت بارش ہو چکی تھی چوتھے پانچویں دن جائے واردات پر گئے سارا جنگل پانی ہو گیا تھا۔ لاش گل چکی تھی، کھینچ کے نکالنے میں سارے عضو الگ ہو رہے تھے۔

دوسرے لوگ کیسوں میں سالوں سال گھسٹتے رہتے ہیں میں نے پہلے ہی دن درخواست لکھوائی کہ جب میں قبول رہا ہوں تو میرا کیس کیوں نہیں جلدی چلا کر جس سزا کا مستحق ہوں دی جائے۔ اس طرح میرا کیس جلدی لے لیا گیا اور پہلی ہی شنوائی پر فیصلہ بھی ہو گیا۔

ابھی بیٹے کو جیل کے ڈاکٹر کے گھر چھوڑا ہے کام کاج کیلئے، چالیس روپیہ ماہانہ اس کے ملتے ہیں دوسرے ٹوپیاں وغیرہ بناتا ہوں کوئی سو روپے وہاں سے بھی بن جاتے ہیں باقی سال کے چھ ماہ ہیں۔ گذر جائیں گے۔"

یہ سارا قصہ سنا کر جب فارغ ہوا تو میں نے پوچھا۔ باہر نکل کر کیا کرو گے۔؟

" باہر ضرور کوئی دھندا وغیرہ کروں گا۔ لیکن پہلے گھر کی فکر ہے۔ بیوی ہونا ضروری ہے گھر والی کے بغیر گھر ویران ہے۔" میں نے کہا۔ تمہیں اب اس کے بعد لوگ رشتہ دیں گے" کہا۔ کیوں نہیں دیں گے! ویسے بھی مجھے اور لوگوں سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔! میری اپنی چچا کی لڑکی بیٹھی ہے، پہلی بیوی کی بہن پڑھ رہی ہے۔ میٹرک پاس کر لیا ہے۔ میں نے پہلے کسی سے کہلوا بھیجا ہے کہ جو کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے گا اس کے سر کی خیر نہیں۔ وہ لوگ بیچارے پہلے ہی مرے ہوئے ہیں، میرا حکم سنیں گے تو سہم جائیں گے۔

سائیں! تکبر نہیں ہے لیکن پیچھے ہمارا بڑا خوف ہے۔"

میں نے اس سے کہا "بھائی عبدالجبار ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جو حقیقت ہے وہ اگر تم نے پولیس یا کورٹ میں بتائی ہوگی تو پھر دنیا کی کوئی کورٹ تمہیں اتنی سی سزا نہیں دے گی۔ وہ کہے گی یہ تو سیدھا قتل ہے غیرت ویرت نہیں۔ پھر کورٹ نے کس طرح تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑا۔؟"

وہ عجیب موڈ نے سے ہنسا پھر کہا "سائیں! آپ خود بالیسٹر وکیل ہیں۔ ہم تو آپ کے سامنے بچے ہیں لیکن اتنی عقل ہم بے عقلوں میں ہے کہ اس بات پر پھانسی ضرور ہو جائے گی۔ سو بس ذرا بات کو گھما پھرا کے جان چھڑانی پڑی "۔۔۔۔۔

آخر وہ چکر بھی بتایا۔" کورٹ کو بتایا کہ واردات والے دن بیوی اور بیٹی کو وہاں بٹھا کر میں پاس والے گاؤں سے پانی لینے گیا کہ کہیں اگر راستے میں مغرب ہو جائے تو روزہ تو کھولیں کیونکہ پھر آگے نہ کوئی بستی تھی نہ پانی۔ کافی آگے چلا گیا تو سوچا کہ بیوی ویسے ہی بھروسے والی نہیں پہلے ہی مجھے ایک آدمی پر شک تھا کہ اس کے ساتھ ہے۔ سوچا ایسا نہ ہو کہ اس کو بھی ٹیم دے دیا ہو اور کوئی خراب کام ہو جائے۔ سو چھوڑ دو پانی کو ذرا تیز تیز چلیں گے تو سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گاؤں پہنچ جائیں گے۔ واپس آکر کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی وہ شخص جس پر مجھے شک تھا۔ قابلِ اعتراض حالت میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تو بھاگ گیا۔ میں اسے پکڑ نہ سکا۔ بیوی کو غصہ میں آکر گلے سے پکڑ لیا۔

اتفاق سے زور زیادہ آگیا اور وہ اتفاقی موت سے مر گئی"۔

"اب سمجھا ئیں" نے اس سے کہا۔ دل ہی دل میں وہ بات بھی سمجھ گیا جو پہلے مجھے اس میں نظر تو آ رہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

بڑی جیلوں میں قتل کے جرم میں کافی مجرم ہوتے ہیں۔ بہت سارے خود ہی کہتے ہیں کہ ہم نے یہ قتل کیا ہے ان حالات میں۔ لیکن وہ واقعی تقریباً اتفاقی قاتل ہوتے ہیں جو بہت غصہ اور جنونی حالات میں قتل کر جاتے ہیں۔ ویسے وہ بالکل عام رواجی انسان ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے معصوم سیدھے سادے، وفادار، نرم دل اور غریب ہوتے ہیں۔ کچھ تو بہت ہی اچھے انسان ہوتے ہیں لیکن مجبوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اب میں سمجھ گیا کہ یہ جوابدار ایک سیدھا سادہ قاتل صفت انسان ہے۔ جو انتہائی آرام سے کسی کا بھی گلا کاٹ سکتا ہے۔

اس دن میں نے پہلی بار اپنے کسی ساتھی قیدی کے بارے میں سوچا تھا کہ اس کو پوری پوری سزا ملنی چاہیئے تھی۔ اور اُسی دن مجھے اپنے کسی قیدی ساتھی سے سچ مچ ڈر لگا تھا۔ سوچا ایسا آدمی کسی کو بھی قتل کر کے، معصوم بن کر چالاکی سے کوئی بہانہ بنا کر سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سال ڈیڑھ سال کی سزا کاٹ کر اپنے آپ کو صاف بچا سکتا ہے۔

ان ہی دنوں ایک سندھی رسالے پر ایک ویتنامی لڑکی کی تصویر چھپی تھی۔ اس نوجوان لڑکی کے سر پر گھاس سے بنی ٹوپی رکھی تھی، گود میں بچہ اور ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ کسی گوریلا دستے کی کمانڈر تھی۔

(۳)

رات ہو چکی تھی۔ باہر طوفانی ہوا چل رہی تھی۔ دروازوں کے تالے ہل رہے تھے اور چٹکیوں کی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔ اس رات بہت عرصے کے بعد میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس تصویر میں دیکھی ہوئی ٹوپی والی ویتنامی لڑکی کی طرح دبلی پتلی خوبصورت لڑکی دو تین گوریلوں جیسے ہتھیار بندوں کے ساتھ دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی۔

دروازے کو اشارہ کیا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اس لڑکی کا لباس ویت نامی تھا۔ ٹوپی اور رائفل بھی
وہی تھی۔ صرف شکل سے سندھی لگ رہی تھی۔ میں نے یکدم اسے پہچان لیا وہ سامنے زمین پر
سوئے ہوئے، بدشکل خونی کی خوبصورت بیوی رحمت تھی۔ اس نے بڑھ کے گود سے بیٹی کو اتار
کے زمین پر بٹھایا اور رائفل دوسرے گوریلے کو دے دی پھر زمین پر سوئے ہوئے جوابدار کے سینے
پر چڑھ کر اس کا گلہ دبانے لگی۔ اس نے چھڑانے کیلئے بہت زور لگایا لیکن چھڑا نہیں سکا۔ آخر
تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ گوریلا کمانڈر لڑکی نے بیٹی کو اٹھایا رائفل کندھے میں ڈالی اور دوسرے
گوریلوں کے ہمراہ واپس چلی گئی۔ دروازے اور تالے از خود بند ہو گئے۔ اتنے میں اس آدمی نے
آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اسکی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اچانک پھر دروازہ بغیر آواز
کئے کھل پڑا۔ گوریلا کمانڈر لڑکی پھر اپنے دستے سمیت اندر داخل ہوئی اور اسے زندہ دیکھ کر
اس کی طرف بڑھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے جان کی بخشش مانگی۔ وہ دو منٹ تک
قہر آلود نظروں سے اسے گھورتی رہی پھر ایک نفرت اور حقارت بھری نظر ڈال کر آگے بڑھ
کر بیٹی کو اٹھا کر رائفل کندھے میں لٹکا کر اپنے دستے کے ساتھ واپس چلی گئی دروازہ چپ چاپ
خود ہی بند ہو گیا۔

آنکھ کھلی تو میرا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا نیچے جھک کر دیکھا جوابدار سو رہا تھا۔

کچھ دن انتہائی غریب اور اشراف بن گیا۔ ایک دن کھانا پکانے والے برداشتی نے کہا کہ
جوابدار کہتا ہے میرا کھانا اس آدمی (آپ کیلئے) کے کھانے سے الگ رکھ لیا کرو میں تم لوگوں کے
ساتھ نہیں کھاؤں گا برداشتی انتہائی شریف آدمی تھا۔ اپنے منہ کا نوالہ بھی کسی مانگنے والے کو دینے
والا۔ میں نے اسے کہا "چھوڑ دو اسے" ابھی دو تین دن ہی نہیں گذرے تھے کہ برداشتی پھر
بھاگا بھاگا ہوا آیا کہا "سائیں! اب مجھے یہاں سے کسی اور جگہ بھیجیئے، یہ جوابدار میری بے عزتی
کروائے گا مجھے ذلیل کرے گا۔"

"خیر۔؟ کیا ہوا۔؟"

"سائیں! میں جب بھی اخبار پڑھتا ہوں تو یہ بھاگتا ہوا قرآن شریف لے کر آتا ہے اور میرے
سر پر کھڑے ہو کر زور زور سے پچا پھیکا پڑھنے لگتا ہے۔ میں کیا کروں۔؟ روکوں کہ قرآن شریف

کی تلاوت نہ کرو، یا تھوڑا الگ کونے میں بیٹھ کر پڑھو۔ اس کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں کوئی
لفظ کہوں اور یہ شور مچائے کہ فلاں مجھے قرآن کی تلاوت نہیں کرنے دیتا۔ پھر میں تو تباہ ہو
جاؤں گا"

خدا خدا کر کے اس جمعدار کو تبدیل کروایا سوچا زیادہ سے زیادہ طبیعت ہی خراب ہو گی
سرکی تو خیر رہے گی۔

اس بات کو سال بھر ہو گیا۔ میں اس درمیان سینٹرل جیل میں آ گیا تھا۔ پہلے تو بہت
سارے لوگ تھے۔ اب کم ہو کر کچھ رہ گئے تھے۔ دو وکیل تھے، تین شاگرد، ایک غیر سیاسی بی کلاس
کا قیدی تھا۔

. . . . * . . . . .

جیل میں ایک طرف تو ہے مار پیٹ اور کام تو دوسری طرف افواہیں، ادھر ادھر کی باتیں
ہنسی مذاق اور گانے وغیرہ کی محفلیں۔

اس جیل میں عبدالجبار کے بارے میں کئی افواہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ "عبدالجبار نے رہا ہوتے
ہی دوسری شادی کر لی اور اس کو بھی غیرت میں مار دیا اور پھر جیل میں ہے" دوسروں کا کہنا تھا کہ
بیوی کو نہیں کسی اور کو مارا ہے تیسروں کا کہنا تھا کہ "دوسری بیوی نے اسے ہی قتل کر دیا" تصدیق
نہیں ہو سکی کہ کونسی افواہ درست ہے، اسپیشل وارڈ جیسے وارڈوں میں بنیادی باتیں تو سیاسی ہوتی
ہیں۔ رات دن مباحثوں کی رٹ لگی ہوئی ہوتی ہے، تھوڑی تھوڑی بات پر لوگ ایک دوسرے
سے لڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں ہر بات زندگی اور موت کی بات لگتی ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ کچھ
لوگ آپس میں باتوں کے ذریعے ہی راضی ہو جاتے ہیں، پھر ذاتی مباحثوں کے سلسلے شروع
ہو جاتے ہیں۔ وہی لوگ سیاسی بحث کے دوران ایک دوسرے کے مخالف نظر آئیں گے
پھر جب وہ بحث ختم ہو گی تو آپس میں محبت نظر آنے لگے گی۔ گھر کے خواہ گذر سفر کے قصے لے
کے بیٹھ جائیں گے مطلب کہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔

آہستہ آہستہ لوگ ایک دوسرے کے حالات سے براہ راست یا بالواسطہ کافی حد تک
باخبر ہو جاتے ہیں۔ ہم چھ کے چھ ہی آہستہ آہستہ آپس میں گھل مل گئے تھے۔ نظریہ ہر کسی

کے پاس اپنا اپنا لیکن بہت سی باتوں پر حال بھائی اور شریک غم تھے۔

محمد علی قتل کے کیس میں تھا۔ اس کی ضمانت نہیں ہو رہی تھی۔ دوسرا انور تھا۔ بی اے فائنل میں پڑھنے والا خوبصورت نوجوان جس کے گاؤں میں رشتے داروں میں کسی رشتہ پر تفرقہ تھا اس کی شادی جہاں ہونے والی تھی وہاں نہ ہو سکی، خاندانی جھگڑوں کی بدولت کہیں اور بھی آسرا نہیں تھا۔ اتنی پہنچ والا نہیں تھا نہ ہی کوئی آمدنی تھی کہ باہر ہی شادی کر لیتا تھا بہت روشن خیال پڑھنے کا بھی اسے شوق تھا۔ میرے پاس جو بھی کتابیں تھیں (چالیس کے قریب) ان میں سے مشکل ہی سے کوئی چھوڑی ہوگی۔ مطلب کہ انور بہت ہی اچھا اور کام کا نوجوان تھا۔

دوسرے شاگرد جمال کی ماں سخت بیمار تھی۔ معافی کے بغیر باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اور معافی کیلئے وہ تیار نہیں تھا۔ ادھر میرے سارے کیس دربدر ہو گئے تھے اور وکالت ختم ہو گئی تھی۔ مطلب کہ ہر کوئی دوسرے کے مسائل اور عادتوں سے واقف تھا۔

بہار کی ایک شام تھی۔ دروازے بند ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

بہت اچھی اور خمار آلود ہوا چل رہی تھی۔ آنگن میں گلاب اور موتیے کے پھولوں کی خوشبو آزاد فضاؤں کیلئے مائل کر رہی تھی۔ مسرور جیلر بھی کچہری میں شامل ہو گیا۔ بحث چلتے چلتے جا کر فلسفیانہ باتوں، تقدیر اور تدبیر، ہونی، انہونی، اتفاق اور قسمت اور مقدر جیسے موضوعات کو پہنچی، مسرور بہت سمجھدار جوان تھا اور قیدیوں کو بھی انسان سمجھنے والا چند نایاب جیلروں میں سے تھا۔ بڑے جوش و جذبے سے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا "سائیں آپ نے کہا کہ کتنی ہی انہونی باتیں صرف ظاہری طور پر انہونی ہوتی ہیں، ذرا سے سازگار حالات ملنے سے "ہونی" اور ممکن بن جاتی ہیں"۔ "مثال دیجئے"۔ میں نے کہا "مثال ہم یہاں سات آدمی بیٹھے ہیں۔ ہم ساتوں اگر نیک نیتی اور انسان دوستی کے اعلیٰ آدرشوں کے لئے آپس میں اتحاد کر کے اپنے سارے وسائل اور جانی، ثابت قدمی سے کتب لانے کا پکا ارادہ کر لیں تو ہم جیل میں ہونے کے باوجود کتنی ہی انسانی جانیں بچا سکتے ہیں۔ فرض کریں یہاں کوئی لاوارث قیدی ہے۔ وہ بے گناہ ہے لیکن کیس اس پر سو فیصد ثابت ہو گیا ہے اور شاید سزا ہو جائے۔ اب اگر ہم یہاں بیٹھے ہوئے جیل کے حالات میں جتنا ہو سکتا ہے اس کے مطابق اور جتنا ہم کر سکتے ہیں اس کے مطابق پوری

کوشش کریں تو شاید اس کی جان بچا لیں۔"

"اگر وہ قبولدار ہو تو۔؟" مسرور نے پوچھا۔

کہا "زبردستی لی ہوئی قبولداری سے دستبردار بھی ہوا جا سکتا ہے۔ بہت سے حالات میں عدالتیں بھی ایسی قبولداری کو رد کر دیتی ہیں۔"

مسرور بھی سوال پہ سوال کرتا رہا۔

لیکن اگر قبولدار، قبولداری سے دستبردار نہ ہو، پھر اور دستبردار ہونے کے لئے تیار ہی نہ ہو اور کہے کہ میں نے بدلہ لیا ہے۔ اب مجھے موت قبول ہے پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟" میں نے کہا "بہت بہت سال پہلے وکالت کے پہلے سالوں میں ایک جوابدار مجھے بھی ٹکرایا تھا۔ غریب تھا۔ وکیل نہیں کر سکتا تھا میں سرکار کی طرف سے Paupers Advocate یعنی مفلس جوابدار کا بہت کم سرکاری فیس پر خیراتی وکیل مقرر ہوا تھا۔"

"میں نے اسے کہا تھا کہ تم کہو کہ میں نے اپنی بیوی کے پاس سے مشکوک آدمی کو نکلتے دیکھا جذباتی ہو کر اور غصہ میں آ کر نیچے پڑی ہوئی سبزی کاٹنے والی چھری دے ماری" وہ کہے "نہیں جناب نہیں! مجھے اس پر شک تھا اس لئے میں خاص طور پر بازار سے نیا خنجر خرید کے لایا تھا گھر آیا تو وہ سو رہی تھی اکیلی۔ خنجر گلے پر رکھ کر ایک جھٹکا دیا تو سانس کی نلکی کٹ گئی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا نہ ہی کوئی آدمی بھاگا تھا۔"

یہ بات سن کر میں نے اسے ڈرانا شروع کر دیا، دھمکایا پولیس والوں کو منتیں کر کے گلے میں شکنجے ڈلوائے کہ پھانسی کے وقت اس سے بھی زیادہ تکلیف ہوگی۔ مگر وہ کوئی مانے! کہے "جناب میں نے جرم کیا ہے مجھے بھلے اس کی سزا ملے، میں ایک مری ہوئی پر الزام لگاؤں کہ میں نے اس کے پاس سے مشکوک آدمی نکلتے دیکھا ہے اور اسے سبزی کاٹنے والی چھری سے مارا ہے اور وہ اتفاقی مری ہے۔"

عدالت میں بیان دیتے وقت میں نے اس کے حق میں بیان دیا لیکن وہ اٹھ کھڑا ہوا کچھ کہنے کی اجازت مانگی، اسے اجازت ملی کہا "جناب وکیل صاحب کی مہربانی میرے بھلے کیلئے کر رہا ہے لیکن میں نے خون کیا ہے، نہ کوئی آدمی نہ کچھ اور سبزی نہ پیاز سیدھا سادہ قتل

کیا ہے تم انصاف کرو" میں نے درخواست دی کہ میرا موکل پاگل ہے سیشن کورٹ نے سول سرجن کی طرف بھیجا۔ اس نے لکھ کر بھیجا کہ سو فیصد ٹھیک ہے۔ سیشن جج کو اس کی ایمانداری سے بہت ہمدردی تھی لیکن اس کے بھی ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ سزا سنادی "پھانسی" ہائی کورٹ بھی کچھ نہ کرسکی فیصلہ بحال ہوگیا۔ سپیشل طبی بورڈ بٹھایا گیا انہوں نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے۔ لاچار انہوں نے بھی فیصلہ بحال کیا اور وہ بچارہ ایمانداری کے کلمے پڑھتا ہوا پھانسی پر چڑھ گیا ... ایسے لوگ بھی ہیں لیکن کچھ خاص حالات کو چھوڑ کر عام حالتوں میں قبولداری پر عمل اور سزا ... سزا کرتے ہوئے بے گناہ لوگوں کو بچایا بھی جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کچھ ہمدرد لوگ مل کر اس کی پر خلوص اور بھرپور مدد کریں .."

اتنے میں سرور کا بلاوا آیا۔ وہ چلا گیا اور بحث اس کے پیچھے بھی جاری رہا۔

(۴)

ایک دن کسی کام سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی آفس میں بیٹھا تھا۔ سرور جیلر بھی ساتھ بیٹھا تھا۔ ڈپٹی کو بڑے سپرنٹنڈنٹ نے بلایا وہ اوپر چلا گیا۔ ہم بیٹھے رہے۔ سرور نے تھوڑا سا جھک کر میرے کان میں کہا "صاحب بھلا ایسے آدمی کو مرنا چاہیئے یا زندہ رہنا چاہیئے۔؟" میں نے ادھر مڑ کر دیکھا جس طرف سرور نے اشارہ کرتے ہوئے بات کی۔ وہ ایک لیڈی سنتری کے ساتھ کھڑی تھی۔ کئی لمحے میری آنکھیں حیرانی سے تکتی رہیں۔ آج تک کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہے کہ اصلی حسن کس چیز سے بنتا ہے؟ حسن ہے کیا؟ حسن کے کل کتنے اقسام ہیں؟ اس کی کتنی جنسیں ہیں؟ حسن ہے کس چیز میں، آنکھ میں، ناک میں، ہونٹوں میں، ہاتھ پاؤں میں یا شخصیت کے مجموعی تاثر میں؟ اور کہاں۔ کہاں؟ کسی فارسی کے شاعر نے سچ کہا ہے کہ حسینوں کی کئی ادائیں ایسی ہیں جن کا کوئی نام نہیں۔ میری آنکھیں جہاں تھیں، وہیں اٹک کر رہ گئیں۔

جامنی رنگ کی شلوار قمیص اور کالا ڈوپٹہ اور سادی سی چپل میں سولہ سترہ برس کی ایک ایسی لڑکی تھی جس کے ہاتھ پاؤں، ناک نقشہ، آنکھیں، ہونٹ عام لڑکیوں جیسے یا ان سے کچھ بہتر تھے۔ لیکن اس کے کھڑے ہونے اور دیکھنے کا انداز۔ اس کے سارے جسم اور چہرے سے جھلکتا ہوا اس کی ذہنی اور جذباتی شخصیت کا اثر جادوئی تھا۔ پتہ نہیں نئی آئی تھی، یا شنوائی سے آئی تھی

یا پیشی کھتی (جیل کے اندر اگر کوئی جرم کیا جاتا ہے تو بڑے صاحب کے پاس سزا کیلئے لایا جاتا ہے اسے پیشی کہتے ہیں)

مسرور نے پوچھا "صاحب کس دنیا میں کھو گئے۔ سوال کا جواب نہیں دیا۔"

بوکھلاہٹ سے کہا "کونسا سوال۔؟ ہاں ... " نہیں اسے زندہ رہنا چاہیئے۔"

مسرور نے کہا "اس دن میں اسی کی بات کر رہا تھا، اس دن اپنے شوہر کو مار کر آئی ہے۔ کہتی ہے برابر میں نے مارا ہے اپنی بہن کا بدلہ لیا ہے اگر پھر زندہ ہو کر آئے گا تو بھی ماروں گی۔ مجھے پھانسی چاہیئے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ میں نے اپنی مظلوم بہن کا بدلہ لیا۔ اب مجھے زندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھ رہے ہیں پاگل کے کام۔"

وہ مسرور کی بات برداشت نہ کر سکی کہا "جناب آپ اپنا کام کریں۔"

اس کا یہ انگریزی کا جملہ سن کر مجھے ایک بے وقوف سا خیال آیا۔ سوچا ایک تکا لگاؤں اور لڑکی کو حیرت میں ڈال کر اس کی لا پرواہی کی زرہ کو ایک بار تو توڑ ڈالوں۔ لیکن تکا کہاں کا؟ میں سمجھ گیا۔ یقیناً یہ وہی گا اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔

یکدم میں نے پوچھا۔

"تم میٹرک پاس ہو؟"

"اس سے آپ کو کیا۔؟ آپ اپنا کام کریں"

میں نے پھر کہا "تم وسندپور گاؤں کی رہنے والی ہو۔؟"

وہ ذرا سی جھجکی لیکن سنبھلتے ہوئے کہا "جی! ہوں تو کونسا گناہ کیا۔؟"

کہا "تم رحمت کی چھوٹی بہن بھاگبھری ہو؟"

اب وہ واقعی حیران ہو گئی۔ ایک پل کے بعد میں نے پھر کہا۔

"تم عبدالجبار کی دوسری بیوی ہو؟"

کہا "ہاں! ہاں میں نے اسے قتل کیا ہے، کیا ہے، آپ کو جو کرنا ہے۔ کریں۔"

کہا "تمہاری بہن رحمت کو عبدالجبار نے گاؤں عبداللہ خان کے پاس جنگل میں قتل کر دیا تھا۔"

وہ اب سیدھی ہو گئی اور فاتحانہ انداز سے کہنے لگی "میں نے بھی اسے اسی جگہ ختم کیا ہے۔ لیکن آپ کو کیسے پتہ ؟"

وہ تعجب سے پوچھنے لگی، "آپ پولیس والے ہیں ؟" "میں جادوگر ہوں" جواب میں کہا "مجھے سب پتہ ہے مجھے پتہ ہے کہ عبدالجبار کیا تھا، اگر واقعی تم نے اسے مارا بھی ہے تو اس میں قصور تمہارا نہیں ہو گا۔ اس نے رحمت کو بھی بے گناہ مارا تھا۔ اسے کم سے کم پھانسی تو ہونی ہی چاہیئے تھی۔"

پہلی دفعہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلے، اس کے چہرے پر بیباکی، چیلنج اور لڑائی کے جذبوں سے اداسی اور درد کے سائے ابھرنے لگے اور پھر اس کی آنکھوں کے کونوں سے دو آنسو بہہ نکلے اور آہستہ آہستہ نیچے سرکنے لگے۔ اس نے انہیں پونچھنے یا چھپانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی صرف گردن جھکالی۔

میں جس کام کیلئے ڈپٹی کے پاس آیا تھا وہ چھوڑ کر چپ کر کے اپنے وارڈ کی طرف واپس چلا آیا۔

دو چار دن بعد سرور ایک فائل لے کر آیا۔ کہا "یہ بھاگبھری کے کیس کی نقل ہے۔ باقی اس کی قبولداری کی نقل اس میں نہیں ہے۔ وہ بھی میں جیسے بھی ہوا اپنے خرچ پر ہاتھ کر کے لے آؤں گا۔ آپ کے لیکچر کا کچھ اثر ہم پر بھی ہوا ہے کہ ایک دوسرے کی جائز مدد کی جانی چاہیئے۔ خاص طور پر مظلوم انسانوں کی بنا لالچ کے امداد کی جائے۔ اب آپ چھ پہاڑ سے مرد لوگ ہو۔ میں آپ کی ذاتی قانونی قابلیت کو اور آپ کے اجتماعی خلوص بھری انسانی ہمدردی کو تب سلام کروں گا جب آپ اس لڑکی کو موت کے منہ سے بچا لو گے۔"

دوسرے ہفتہ قبولیت کی نقل بھی مل گئی جو انور نے پڑھی اور ہم سب نے سنی۔

"میں بھاگبھری زوجہ عبدالجبار، مسلمان، بالغ، عمر تقریباً ۱۶ ار سولہ سال ذات ۔ کہتی ہوں کہ مجھے کسی نے بھی ورغلایا نہیں، نہ ہی کسی نے کوئی آسرا دیا ہے یا للچایا ہے ہوش و حواس کی سلامتی اور اپنی رضا خوشی سے مندرجہ ذیل بیان دیتی ہوں۔

میرا نام بھاگبھری بنت اللہ ڈنہ زوجہ فوتی عبدالجبار ذات ۔۔ گاؤں ونڈپور تحصیل ۔۔

ضلع ـــ ہے۔ میں اللہ ڈنہ کی دوسری بیٹی ہوں، پہلی بیٹی رحمت تھی جو نویں جماعت میں پڑھتی تھی
فوتی عبدالجبار نے پہلے میرے والدین کو ڈرا دھمکا کر میری بڑی بہن سے شادی کی۔ پھر اسے بند کر
دیا۔ ہمارے پاس آنے بھی نہیں دیتا تھا اور پھر وہ لوگ شہر چلے گئے۔ آخر ایک دن اسے ہمارے
پاس لانے کے بہانے راستے میں گلہ دبا کر ہلاک کر دیا اور میری بہن پر جھوٹا الزام لگا کر، عزت کا بہانہ
بنا کر، خود کو بچا لیا۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ آزاد ہو کر آیا۔ میں نے میٹرک پاس کیا تھا۔ فوتی نے
ایک بار پھر میرے والدین کو قتل کرنے کی دھمکیاں دے کر، گاؤں کے لوگوں کا دباؤ ڈال کر میرے
ساتھ زبردستی شادی کی، میں نے نکاح میں کوئی وارث بھی نہیں لیا اور صاف انکار کر دیا۔ لیکن مجھے
والدین نے ڈر کے مارے زبردستی عبدالجبار کے حوالے کر دیا۔ صرف لوگوں کے سامنے یہ وعدہ کیا کہ
عید براد پر اپنے گھر والوں سے ملنے کے لئے نہیں روکوں گا۔ پھر وہ مجھے بھی شہر لے جا کر رہنے لگا جہاں
میری بہن اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ مجھے خواہ مخواہ مار پیٹ کرتا۔ ہمیشہ کہتا کہ پڑھنے کی وجہ سے تمہارا
دماغ خراب ہو گیا ہے، میں تمہیں بھی ختم کر دوں گا، تیسری شادی بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے ہر وقت
اس سے جان کا خطرہ رہتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اگر کوئی ایسا وقت آیا تو میں
بھی اپنے آپ کو بھیڑ بکری کی طرح بغیر مزاحمت کئے اس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دونگی۔

واردات والے دن ہم شہر سے اپنے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ عید کرنے کیلئے جب
گاؤں عبداللہ کے نزدیک جو جنگل ہے وہاں پہنچے تو اس نے کہا کہ یہاں تھوڑا آرام کریں گے اور
ہم بیٹھ گئے۔ میں درخت کے ایک مضبوط تنے سے پیٹھ لگائے بیٹھ گئی۔ اس نے پھر وہی باتیں
شروع کر دیں کہ عید پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم ضد اور نافرمانی کر کے چل رہی ہو۔ میں غیرت
والا اور دلیر ہوں، مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

تم اپنی بہن سے بھی زیادہ مغرور ہو، میٹرک پاس کیا ہے تو اپنے آپ کو اونچی چیز سمجھنے
لگی ہو۔ میں تمہیں ایسا ٹھیک کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔ یہ سامنے جو درخت دیکھتی ہو نہ! اسی درخت
کے نیچے تمھاری بہن کو اس کے غرور کی سزا دی تھی۔

فوتی کی یہ باتیں سن کر میرے دل میں میری بے گناہ بہن کی مظلومیت کی آگ جلنے لگی، میں
نے بھی کہہ دیا کہ جبار! تم اتنا تکبر نہ کرو، قدرت کے قہر سے ڈرو قدرت چاہے تو تم بھی میری بہن کی

طرح گلی ہوئی لاش بن سکتے ہو۔"

یہ بات سن کر اسے آگ لگ گئی "تمہاری یہ مجال" کہہ کر کلہاڑی اٹھا کر مجھ پر حملہ کرنے کیلئے دوڑا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آج یہ مجھے مار دے گا۔ موت اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہی مجھ میں ازغیبی قوت آگئی، میں نے سوچا کہ اگر اس نے حملہ کر دیا تو مجھے کیا کرنا چاہیئے جب اس نے مجھے کلہاڑی ماری تو میں نیچے جھک گئی اور کلہاڑی مضبوط تنے میں جا کر پھنس گئی۔ جب تک وہ تنے سے کلہاڑی چھڑاتا میں نے اپنے پاس پڑی ہوئی مضبوط سوکھی ہوئی ٹہنی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ میں نے پھر ڈر کے مارے وہ ٹہنی مسلسل برسانی شروع کر دی۔ آخر وہ نیچے گر گیا۔ لیکن پھر اٹھنے کی کوشش کی پھر میں بھی ڈر کے مارے تب تک مارتی رہی جب یقین ہو گیا کہ اب ختم ہو گیا ہے جب دیکھا کہ اب مر گیا ہے تو وہ ٹہنی لے کر گاؤں عبداللہ خان چلی گئی اور کہا کہ میں نے اپنے شوہر کو مارا ہے مجھے پولیس کے حوالے کر دو۔

میں عدالت کو صاف بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے پیاری بہن کے ناحق قتل کا بدلہ لیا ہے اور ایک خونی کو قتل کیا ہے عدالت انصاف کرے۔"

جب بیان کی نقل پوری ہوئی تو سب سے پہلے محمد علی خان نے جوش میں آکر کہا "لعنت ہو بے شرم۔ بے غیرت عورت شوہر کو مار کر اب نخرے دکھانے آئی ہو۔ لعنت ہو پھٹو ی۔"

انور غصہ میں سرخ ہو گیا۔ کہا "واہ محمد علی خان واہ، کیا انصاف کیا ہے، آخر دکھائی نہ اپنی رجعت پسند لائن۔" میں نے دوستوں کو کہا کہ "چارلی کی ایک فلم تھی جس میں وہ تین دوست تھے۔ چارلی کے ہاتھ میں ایک گھنٹی ہوتی تھی۔ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں ایک دوسرے کے گردن میں بازو ڈال کر چلتے درمیان میں چارلی ہوتا تھا۔ جہاں بھی چارلی کو کوئی خیال آتا تو وہ گھنٹی بجاتا اور کہتا "میٹنگ" یہ آواز سن کر بسارے رک جاتے اور کھڑے کھڑے ہی کسی بھی بات پر مشورہ کر لیتے۔ ہمارے پاس گھنٹی تو نہیں لیکن اس مسئلہ پر ہم بھی میٹنگ کر لیتے ہیں"

عبدالجبار نے جو روداد مجھے بتائی تھی وہ میں نے سرسری دوستوں کو بتائی۔ اور کہا "اب ساری حقیقتیں آپ کے سامنے ہیں۔ اب میں سوال کرتا ہوں کہ کیا اس لڑکی نے بے واجبی قتل کیا ہے؟"

پہلے محمد علی نے کہا "جی بالکل بے واجبی لعنت ہو۔"

پھر انور نے کہا "یہ قتل تو ہے ہی نہیں۔ اپنی جان بچائی ہے لیکن اگر واقعی قتل بھی کرتی تو بھی جائز تھا۔ اپنی بہن کا بدلہ لینا اس کا فرض تھا۔"

جمال نے کہا "حق پر ہے ہمارا اسے سلام ہے۔"

دوسرے شاگرد کمال الدین نے صرف اتنا کہا "بے گناہ ہے اس پر سلام ہو۔"

وکیل محمد اسماعیل نے کہا "Self defence کا کیس لگتا ہے۔ بظاہر لڑکی سچ کہہ رہی ہے۔"

میں نے کہا "میں اکثریتی رائے سے متفق ہوں۔ لڑکی کو خود کو بچانے اور بدلہ لینے دونوں کا حق تھا۔ وہ بے گناہ ہے۔"

سب اٹھنے لگے میں نے کہا "یہ میٹنگ ابھی جاری ہے۔ میری تجویز ہے کہ اگر ہم سب اس بات پر متفق ہوں تو اس بے گناہ لڑکی کو بچانے کیلئے اپنے حال کے مطابق مدد کی جائے۔"

محمد علی خان نے کہا "میں تجویز کا مخالف ہوں لیکن اگر اکثریتی رائے یہی ہے تو مجھے بھی منظور ہے۔"

دوسروں نے بھی اتفاق کیا۔

آخر فیصلہ ہوا کہ ہر کوئی جتنے ہو سکے پیسے دے۔

محمد اسماعیل نے کیس کی Factual aspects کی قانونی یادداشت کی Brief تیار کی۔
میں نے کیس کی Legal aspect کی قانونی یادداشت تیار کی طے پایا کہ میں اور محمد اسماعیل مل کر ایک دوست مسٹر فیض محمد وکیل کو خط لکھیں گے کہ وہ یہ کیس چلا کر لڑکی کو آزاد کرا لے۔
خط لے جانے کیلئے آدمی محمد علی خان کا ہوگا۔

محمد علی خان نے پانچ سو روپے دیئے۔ میں نے اور محمد اسماعیل نے دو، دو سو، شاگردوں نے پچاس پچاس کل ہو گئے ۱۰۰۰ روپے ان میں سے پچاس اس آدمی کو بطور کرایہ دیئے جائیں گے جو خط لیکر جائے گا باقی ایک ہزار اور خط فیض محمد وکیل کو بھیجا۔ لکھا کہ

پیارے دوست فیض محمد!

انسان دوستی کے جذبہ کے تحت ہم نے اس کیس میں ہاتھ ڈالا ہے، آپ کے

آسرے پر۔ آپ اس کام کو ہمارا ذاتی کام سمجھیں گے۔ اور اس میں اتنی ہی دلچسپی لیجیئے گا ہم
فیس ادا نہیں کر سکتے۔ یہ مختصر رقم محض کرایہ کیلئے ہوگی۔ کیس چلنے والا ہوگا۔ وکالت نامہ
جلد ہمیں بھیجے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ عدالت قانون کے مطابق صرف شہادت کے ظاہری
روپ (form) کو نہیں دیکھے گی لیکن اس کے تہہ تک جاکر اس کی اصلیت content
کو بھی دیکھے گی اور دونوں میں ٹکراؤ کے نتیجے میں حقیقی اصلیت کو ظاہری روپ پر ترجیح دے
گی۔ اس کیس میں قبولیت کے علاوہ کوئی دوسری آنکھوں دیکھی شہادت نہیں۔ قبولیت
میں بھی تضاد ہے۔ جیسے واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق اپنی جان بچائی گئی ہے۔ اور
اس طرح ذاتی بچاؤ کا قانونی حق استعمال کیا گیا ہے جو جرم نہیں۔ صرف آخر میں بدلہ لینے کا
ذکر ہے اس جملہ کا اصل واقعہ سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ یہ صرف خود کو ایک نفسیاتی جواز دینے
کے لئے کہا گیا ہے۔ کیونکہ جو ابدارن ذاتی بچاؤ کے قانونی حق کی موجودگی اور وہ بھی کسی عورت کو ایسا
حق میسر ہو اور وہ بھی اپنے شوہر کے خلاف۔ اس حقیقت سے ناواقف ہے۔ دوسری طرف بدلہ
کی بات تو ہر کوئی کرتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنی قانونی طور پر جائز (لیکن اس کی ناواقفیت کی بدولت
اپنی نظر میں ناجائز) کام کو بدلہ کہہ کر اس کے لئے ایک اخلاقی اور جذباتی جواز پیدا کرنے کی کوشش
کی ہے۔ یہ واقعہ سے بعد کا Post Facto جذباتی اور نفسیاتی عذر ہے اور بس! واقعہ کی حد تک اس میں
بدلہ کا کوئی بھی عنصر Factually موجود نہیں۔ بدلہ والا جملہ لڑکی کی معصومیت، ناواقفیت اور
ایمانداری کا ثبوت ہے کہ وہ خود کو محض بچانے کے لئے نہیں بچا رہی اور جو دل میں آیا ہے وہ
بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہم نے اس کیس کے متعلق آپ کی مدد کے لئے
حقیقی خواہ قانونی یادداشتیں شامل کی ہیں، مناسب سمجھیں تو ان پر بھی ایک نظر ڈالیے گا۔
قانونی اسناد اور حوالے تین سال پہلے تک کے ہیں۔ ان کو دیکھ کر باقی تین سالوں میں قانون
کے اندر کی ہوئی amendments کو بھی دیکھ لیجیئے گا حالات کی شہادت۔ circumstantial
evidence بھی جوابدارن کے فائدہ میں جاتی ہے۔ کلہاڑی اور درخت پر اس کے نشان کا ذکر واردات
کے مشیر نامے میں کیا گیا ہے۔
امید کرتے ہیں کہ آپکو کوئی خاص تکلیف نہیں ہوگی۔

کامیابی کے دعاگو۔

ہمارے پاس بڑے وکیلوں کی فیس نہیں تھی۔ فیض محمد کوئی بڑا وکیل نہیں تھا لیکن یار ویسا آدمی تھا۔ ہم نے سوچا کہ بنیادی کام ہم نے اسے کر کے دیا ہے۔کیس بھی پیچیدہ نہیں ہے اگر ہمت کرے گا تو، کامیاب ہو جائے گا۔

سرور جیلہ بڑی مشکل سے بھاگبھری سے اس وکیل نامے پر دستخط لینے میں کامیاب ہوا۔

بھاگبھری کی بھی رسمی شنوائیاں چلتی رہتی تھیں ہم میں سے بھی کسی نہ کسی کا اپنی اپنی شنوائی پر جانا ہوتا رہتا تھا تو ایسے آتے جاتے ماڑی (جیل کے دروازے والی آفس) پر کبھی کبھی بھاگبھری سے علیک سلیک ہو جاتی تھی۔

ایک دفعہ میری اور انور کی ایک تاریخ تھی۔ ہم باہر جانے کیلئے ماڑی پر پہنچے تو وہ بھی شنوائی سے آ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی "سب سمجھتی ہوں ... لیکن اتنا بتا دوں اپنے بیان سے ذرا برابر نہیں پھروں گی۔"

میں نے کہا "تم پتہ نہیں کیا سب سمجھتی ہو۔ ! ہمیں تو کچھ پتہ نہیں، تمہیں بیان سے پھرنے کیلئے کون کہتا ہے۔!" دوسری مرتبہ بھی انور اور میں ساتھ تھے۔ اس کے ساتھ اتفاقی ملاقات ہو گئی۔

کہا "، آپ لوگ مجھے چھڑانے کیلئے بھلے زور لگائیں لیکن حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ میں جو اپنی جان سے ہاتھ اٹھائے کھڑی ہوں۔"

"تم سدا اپنی جان سے ہاتھ اٹھا لو" میں نے موقع پا کر انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم نے رشتے بھی طے کر لیے۔ تمہیں جو چاہے خبریں کرتی پھرو۔"

دونوں سرخ ہو گئے۔ انور کا سر جھک گیا اور بھاگبھری نے روکھے لہجے میں کہا "آپ کوئی لوگوں کے وارث ہیں۔" میں نے کہا "لوگ تو زبردستی شوہر بن جاتے ہیں۔ ہم اگر زبردستی وارث بن گئے تو کیا قصور ہو گیا۔"!

"جلدی نہیں ہے،" کہتی ہوئی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ جاتے ہوئے ٹیڑھی آنکھ سے انور کو دیکھتی جا رہی تھی۔ ہمارا یار انور بھی کسی سے کم تو نہیں تھا۔ میں نے

یہ بات آگرہ دوستوں کو بتائی پھر تو انور کو "سرکاری" طور پر دولہا بنا دیا اور ہلکی پھلکی رشوتیں لینے لگے۔

"دولھے میاں پانی تو پلاؤ" دولھے میاں ذرا سر تو دباؤ، دولھے ذرا بوٹ تو پالش کر کے دو کل تو لاڈ ہوں گے آج تو خدمتڑی کرو"

کچھ جھوٹی ہمدردی سے کہیں "نہیں بھائی، ہمیں کوئی اپنا یار مروانا تھوڑا ہے یہ لڑکی نے پہلے ہی شوہر کو مار کے دیکھا ہے۔ ہمارے یار سے ذرا مشٹیک ہو جائے تو دیر ہی نہیں کرے گی۔"

انور بھی بجاتے شرملاتے سب کی خدمتڑیاں کرتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ بھاگبھری کے قریب سے گذرتے جلدی جلدی میں صاف کہہ دیا "ہم نے تمہارا اور انور کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ اب چاہے تو ہماری بات کو پانی دینا چاہے تو رد کر دینا" یہ کہہ کے میں اسے کسی قسم کے جواب کا موقعہ دیئے بغیر آگے نکل گیا۔ باقی کام دونوں کی سمجھ، ہمت اور قسمت پر اور سرور کی ہوشیاری پر رکھ دیا۔

آخر کیس چلا۔ بھاگبھری نے وہی بیان دیا جو پہلے بھی دیا تھا وہی جملہ کہا کہ "میں نے اپنی بہن کا بدلہ لیا ہے"

تیسری یا چوتھی شنوائی پر سرور دوپہر کو جلدی جلدی وارڈ میں آیا "مبارک! مبارک آرڈر آگیا"۔

"کاہے کا آرڈر؟" ہم سب نے حیرانی سے پوچھا۔

"بھاگبھری کو چھوڑنے اور اسے دارالامان بھیجنے کا جیسے ہم نے آپس میں فیصلہ کیا تھا ویسا ہی ہوا۔ لاکھ لاکھ مبارک ہو"

ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ لڑکی آزاد ہونے کے بعد اپنے گھر والوں کے پاس نہیں بلکہ دارالامان بھیجی جانی چاہیئے وہاں انور آزاد ہونے کے بعد جا کر اسے ملے گا اور قسمت آزمائے گا۔

جیل کا دستور ہے کہ جو آدمی رہا ہو کر جاتا ہے وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ جن کی جیل کے اندر ایک دوسرے کے بغیر نہیں گذرتی باہر جانے کے بعد اس کا پتہ بھی مشکل سے ملے گا جیل اور باہر کی دنیا میں فرق بلکہ تضاد ہی ایسا ہے کہ باہر آدمی کو جیل کے اندر والے

سے بولنے کیلئے الفاظ ہی نہیں ملیں گے۔ ایک دوسرے سے کیا کہیں ؛ دونوں کے مسائل الگ۔ جیل والوں کا دن ہی مشکل سے کٹے اور باہر والوں کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی

اُٹھاں، میںہاں دا کیہا میلا

اوچرن جھنگ وِچ اوچرن بیلا

والی بات ہو جاتی ہے۔

دو تین مہینوں* کے بعد ہماری سنگت سے لوگ نکلنے شروع ہو گئے، پہلے محمد علی خان کی ضمانت ہوئی پھر انور رہا ہوا۔ پھر محمد اسماعیل، آخر میں رہا ہونے والوں میں سے صرف میں اور کمال الدین رہ گئے پھر نئے لوگ آگئے، ولی محمد، نور علی، احمد خان اور دوسرے۔ جیل اور مسافر خانہ خالی ہونے والی جگہیں ہی نہیں۔ ایک جاتے رہیں گے دوسرے آتے رہیں گے۔

کئی ماہ گذر گئے۔ ایک دن ملاقات آئی۔ جا کر دیکھوں تو اپنے دستوری ملاقاتیوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ پھر اچانک انور پر نظر پڑی۔ اس کے ساتھ اجرک میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ بھی کود کے آئی اور پیر چھو کے "بابا" کہہ کے ملی۔ دیکھوں تو بھاگبھری۔ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا "پہلے ہی تین بیٹیوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔ یہ چوتھی سزا کس جرم میں۔؟"

میرے لئے جو کتاب اور رسائل خرید کے لائے تھے وہ مجھے دیتے ہوئے، منہ چھپاتے تجّت سے کہنے لگی "یہ سزا اس جرم میں کہ بغیر کسی سے پوچھے پرائی بیٹیوں کے رشتے طے کرتے پھرتے ہیں پھر ان لوگوں میں پھنس جاتے ہیں اور جان چھڑائی نہیں جاتی۔"

انور نے مسکرا کر کہا "سائیں، سن لیجیے باتیں۔"

میں نے دیکھا وہ خوش تھی۔ پہلے بے باک، لڑاکی؛ مرنے مارنے کیلئے تیار رہتی تھی اب ان صفات کے اوپر بے انت خوشی، سرشاری، خود اعتمادی اور انسانی رشتوں ناتوں پر اعتبار اور ناز کے احساسات چھلکتے ہوئے تھے۔ اس سے پوچھا "انور کیسے چلتا ہے تمہارے ساتھ ٹھیک ٹھاک ہے یا ذرا کان پکڑ کریں؟"

بھاگبھری نے اور مظلوم بن کر کہا "سن بابا سائیں!"

انور نے کہا "سائیں! ہماری بولتی بند ہے یار لوگوں نے پہلے کہی کہا ہے کہ اگر کوئی "منگیک"

ہو گئی تو جان کی خیر نہیں۔ اس کے علاوہ اب تو بندوق بھی چلانا سیکھ لی ہے۔ مجھ سے بھی اچھی نشانہ باز ہو گئی ہے۔ اب ہماری نہیں چلتی" بھاگبھری طرف مسکراتی رہی۔

اس کے بعد میں بھی آزاد ہو گیا اور پھر ملنا نہیں ہوا۔

(۵)

تین چار سال کے بعد اسے اپنے گھر حیدرآباد میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ زیادہ خوشی اس لئے ہوئی کہ اسے بختاور کے روپ میں دیکھا۔ وہ بختاور جس کی ہر جگہ تعریف اور نام تھا۔ وہ یہ ہماری بھاگبھری تھی۔ وہ دن واقعی میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے تھا۔ جب کھانے پر بیٹھے تھے تو مجھے یاد ہے۔ میں نے پوچھا تھا۔

"پگلی اتنے سالوں میں کوئی خط بھی نہیں لکھا! کوئی حال احوال بھی نہیں دیا۔"

کہنے لگی "سوچا کہ دو چار لفظ بیٹھ میں ہوں، اچھی بری سمجھ آجائے کچھ آنے والے کا قومی کام بھی کر لوں۔ منہ دکھانے کے قابل بن کر تو آؤں۔"

کھانے کے بعد انور سے خوب کچہری ہوتی۔ جیل میں بیتے دنوں کے بارے میں۔ ان کی ان دنوں کی زندگی کے بارے میں۔ پتہ چلا کہ بھاگبھری گاؤں میں ٹیچر ہو گئی تھی۔ بی اے پرائیویٹ پاس کیا تھا۔ ایم۔ اے کی تیاری کر رہی تھی۔ انسانیت، سوچ، جدوجہد اور قربانی کا سبق دینے والی سینکڑوں کہانیاں، ناول، شعروں کے مجموعے اور دوسرے علمی قطعات اچھی طرح پڑھ چکی تھی۔ خود کو دل و جان سے بہتر دنیا تعمیر کرنے کیلئے، جدوجہد کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔

چھٹیوں کے دنوں میں خاص طور پر ویکیشن میں گھر میں بیٹھتی نہیں تھی۔

خود انور بھی پیچھے نہیں تھا۔ اس کے دو بھائی تھے جو کھیتی باڑی کرتے تھے خود ایک ایسی نوکری کرتا تھا جس میں تنخواہ تو زیادہ نہیں تھی لیکن دونوں میاں بیوی اپنی مجموعی کمائی سے روکھا سوکھا کھا کر اپنے کام سے لگے ہوئے تھے۔

اس کے بعد دو تین سال ہو گئے ہر کوئی اپنی پریشانی میں تھا ایسے میں ایسا وقت پھر آیا کے دھرتی انگارے بن گئی۔ وہ ہر جگہ بہانے بنا کر دیہاتوں میں گھر آئے انور کے پڑوس گاؤں میں تو بڑی آگ لگا دی تھی۔

ٹیلیگرام ملنے کے بعد میں جب کریما کو ساتھ لیکر اسپتال پہنچا تو بھاگ بھری کی ساس نے بتایا کہ" دن دھاڑے دوپہر کے سمے اچانک دیکھا تو خدا ماروں نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا اور فائرنگ شروع کردی تھی- ہم میں سے جن کے پاس جو بھی ہتھیار تھا وہ اسے لیکر مقابلہ کرنے لگا- کئی گھنٹوں تک فائرنگ چلتی رہی- دونوں طرف سے لوگ زخمی ہوئے اور میرے بیٹے پہلے ہی جیل میں چلے گئے تھے- بہو کو بھی خدا کی مار ہو ان پر زخمی کردیا آخر بے ہتھیار لوگ کتنا لڑتے، دشمن گاؤں میں گھس آئے مار پیٹ کے سارے مرد ساتھ لے گئے- خدا ان کے بچوں کو رُلائے، ہمارے سارے بچوں کو رُلادیا" وہ عورت ساس کے ساتھ کھڑے ہوئے دوسرے رشتہ داروں کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے -

. . . * . . .

اللہ بخش کے گھر کے آنگن میں ان باتوں کو یاد کر کے بھاگبھری کی زندگی پر سوچتے سوچتے پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی-

تیسرے دن صبح کو سیدھا ڈاکٹر اللہ رکھا کے پاس گیا- اُس کے چہرے پر تازگی دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ زندہ ہے -اور اس کی حالت خطرے سے باہر ہے، حقیقت اس سے بھی بہتر تھی- اس کے صحت مند جسم اور روح نے موت سے پہلی بازی جیت لی تھی، وہ ہوش میں آچکی تھی- اپنی پیاری سہیلی کو ہوش اور حواس میں دیکھ کر کریما کا کملایا ہوا چہرہ خوشی سے گلاب کی پھول کی طرح کھِل اٹھا-

میں نے اپنے آپ کو پورے طور پر قبضے میں کر کے چہرے پر مسکراہٹ چڑھائے اُس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھ کے مسکرا کے کہا" میں نے سمجھا تھا تم بغیر خدا حافظ کہے اور بغیر ٹکٹ کے چلی گئی ہو گی، لیکن تم تو شیرنی بنی بیٹھی ہو"- اُس کے ہونٹ ہلے سر جھکا کے جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ کہے وہ میں نے سُنے- اُس کا وہ پرانا تکیہ کلام "جلدی نہیں ہے"- استنے میں پھر ہونٹ ہلے کریما نے جھک کے اُس کی بات سُن کر قہقہہ لگایا اور کہا" ابو پتہ ہے کیا کہہ رہی ہے، ایک تھپڑ لگاؤں پگلی کہیں کی کہتی ہے اتنی تکلیف کیوں کی"

ہم اُسی دن گھر واپس آ گئے۔ دوسرے ہفتے پھر دیکھنے گئے اور ہر ہفتے آتے رہے۔ اس درمیان اُس کے بچے، ماں باپ اور بھائی بہن بھی آ گئے، اُس کی تنظیم کی کئی ساتھی بھی اپنے بھائیوں، شوہروں یا بوڑھی عورتوں کو ساتھ لیکر ہسپتال میں آتی جاتی رہتیں تھیں۔ ہر کوئی اپنے حال کے مطابق اُس کے لئے کچھ نہ کچھ لاتا تھا۔ اسپتال میں سبھی اُسے بھاگ بھری کے نام سے پکارتے تھے۔ کرپا نے انہیں سمجھایا کہ یہ نام اس پر سسرال والوں نے رکھا تھا۔

دو ماہ کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ ایک دو دن میں اس کی ہسپتال سے چھٹی ہونے والی تھی۔ اُسے خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے آہستہ سے پوچھا تھا۔

"بھاگ بھری اس کا مطلب ہے اس دفعہ لوگ تم سے بازی جیت گئے؟" اُسے جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا۔

"کیوں بابا؟"

اس کی ساس نے کہا "ادا، تینوں خدا ماروں کو تو میں نے اپنی بیٹی کے فائرنگ سے مرتے دیکھا اور مجھے پتہ نہیں"

میں نے کہا، "بھاگ بھری تم واقعی بخت آور ہو اس نئے دور کی بخت آور"

— o —
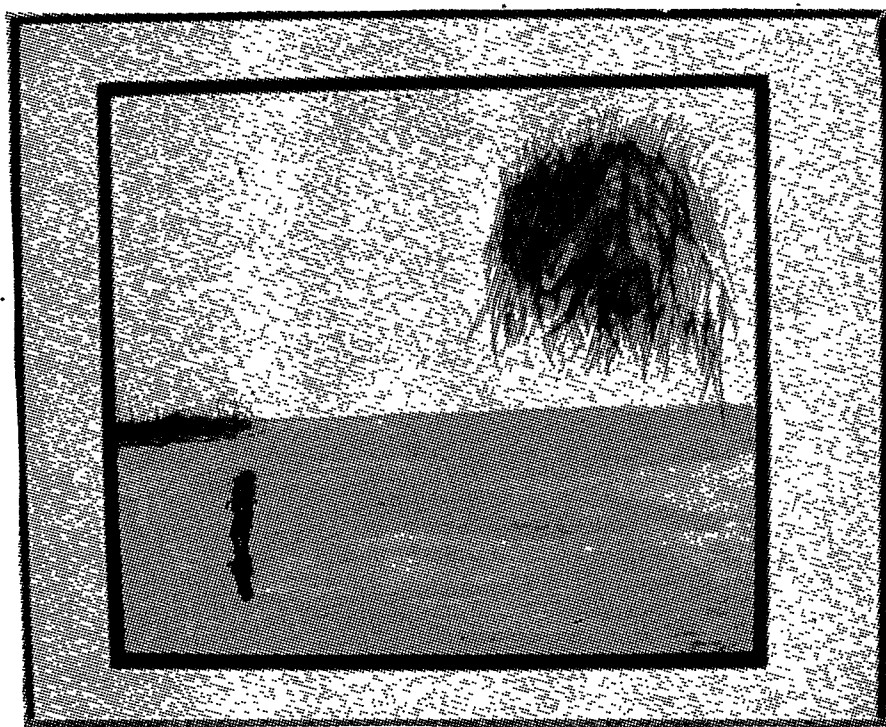
آخری بوند کی خوشبو

زاہدہ حنا

پرندوں کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔ اُن کی اُڑان سے آسمان پر آڑی ترچھی لکیریں کھنچ رہی تھیں جو آہستہ آہستہ چندن، پیپل اور نیم کے پیڑوں میں غروب ہو رہی تھیں، واپس ہونے والوں کی آوازوں کے گھنگھرو، بستی کے تمام آنگنوں میں بج رہے تھے اور اڑان سے تھک کر ٹوٹ جانے والے ان کے گرم پر ہوا میں دائرے بناتے ہوئے زمین پر گر رہے تھے۔

سنچل فقیر کی آواز دو چار گلیوں پرے سے آئی۔ دل مورے موں دوست کا ڈیرا سائیں کا ڈیرا، قلب کے بیچ ہے کعبہ جو قبلہ، بیچ بہے گنگا، بیچ بہے دجلہ، من ماہیں تیرتھ میرا دوست، کا ڈیرا سائیں کا ڈیرا، اس کی پرسوز اور پاٹ دار آواز اکتارے کی تن تن پر چھائی ہوئی تھی اور ریگستانی ہوا کے آہنگ کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

یہ آہنگ سائیں فیض بخش کے سینے میں نیزے کی آنی کی طرح اُترا تو انہوں نے بیقرار ہو کر پہلو بدلا، انہیں محسوس ہوا کہ سیاہ لفظوں والے زردی مائل کاغذ پر دھندلاہٹ کی راکھ جمنے لگی ہے اور وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دمشق کے بازار سے واپسی پر، خوش ادا کنیزوں اور دانش جو غلاموں کی کچہری سے اٹھنے پر آمادہ کریں۔

سنچل فقیر کی آواز دور جانے لگی، ہنس کی ڈوبتی ہوئی آواز کی طرح وہ نواب لغاری کا عاشق تھا اور عموماً انہی کا کلام گاتا تھا۔ کبھی سندھی میں، کبھی ہندی میں، دل مورے موں دوست کا ڈیرا، سائیں کا ڈیرا۔ اُنھیں پھریری سی آئی اور انہوں نے سر جھٹک کر گرد و پیش پر نظر

کی، باہر کی شام کا نارنجی پن ان کی اوطاق تک پہنچتے پہنچتے سرمئی غبار بن گیا تھا اور سہ پہر اُسے اوڑھتی جارہی تھی۔

روز کی طرح انہیں اس وقت بھی حیرت ہوئی۔ اتنی جلدی؟ یہ اندھیرا پھر اتنی جلدی اُتر آیا

اُنھوں نے ایک آہ بھری، چراغ کے انتظار میں تکیے کے نیچے سے مور کا چھوٹا سا پر نکالا اور اُسے مثنوی کے چوتھے دفتر میں رکھ دیا۔ دن کی روشنی میں اس کا طاؤسی رنگ کیسی چھب دکھاتا تھا لیکن اس وقت، تو وہ بھی سیاہ نظر آرہا تھا، پھر حقیقت کیا ہے؟ دن کی روشنی میں اس کے سارے رنگ یا جھٹپٹے کے سمے اس کی سیاہی؟ لیکن حقیقت شاید کہیں تھی ہی نہیں!

انہوں نے مثنوی کے چوتھے دفتر کو اپنے پلنگ کے برابر رکھے ہوئے صندوق پر رکھا تو ان کا ہاتھ ایک اور کتاب سے چھو گیا۔ یہ، شاہ جو رسالو تھی گویا ان کے ہاتھ نے اپنی گزشتہ اور آئندہ صبحوں کو چھولیا تھا یہ ان کا پرانا معمول تھا کہ صبح کا آغاز وہ، شاہ جو رسالو سے کرتے اور ان کا سینہ اپنے پن سے بھر جاتا۔ پھر دوپہر ڈھل جاتی اور ان کا دل عشق، جبر و قدر، وحدت الوجود اور وحی والہام کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے بیتاب ہوجاتا اور سائیں فیض بخش ایک ایسے شکاری بن جاتے جو پہلے تو ہرن کے نقش قدم دیکھتا ہوا اس کے تعاقب میں چلتا چلا جاتا ہے اور جب اس کے نقش قدم دھندلا جاتے ہیں، نظر نہیں آتے تو نافۂ آہو کی خوشبو کا دامن تھام کر اُس کی سمت بڑھتا رہتا ہے، ہچو صیادے سوئے اشکار شد، گام آہو دید و بر آثار شد، چند گاہش گام آہو درخوراست، بعد ازاں خود ناف آہو رہبر است،

وہ ان اشعار کو سینکڑوں بار پڑھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ وہ آج بھی حقیقت و معرفت کے ہرن کی تلاش میں چلتے چلے جارہے ہیں۔ اس سفر کا خاتمہ نہیں تھا اور یہی اس کا حاصل تھا۔

دہلیز پہ چوڑیاں بجیں اور روشنی کی لکیر کھنچ گئی۔ انھوں نے اپنی چہیتی بیٹی کو دیکھا، ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اوطاق چراغ کی روشنی سے بھر گیا ہے یا نوری کے چہرے کی دمک سے وہ طاق میں چراغ رکھ کر اُن کے پاس آئی اور انہوں نے اُسے اپنی باہوں میں بھر کر سینے سے لگالیا۔ بیٹی کا باپ ہونا کیسی نعمت تھی، کیسا عذاب تھا۔

اچانک سارا گرد و پیش اونٹوں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازوں سے

بھر گیا۔

"بابا یہ اس سمے کون سا قافلہ ہے؟" نوری نے قدرے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"ہمیں کیا بیٹا۔ کہیں سے آئے ہوں گے، کہیں چلے جائیں گے، ہمیں نہ لوگوں کے آنے سے غرض، نہ ان کے جانے سے علاقہ" انہوں نے چراغ کی تھرکتی ہوئی لو پر پتنگوں کا رقص دیکھا۔

نوری ان کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی اور بستر پر بچھی ہوئی بوسیدہ چادر کی سلوٹوں کو اپنی انگلیوں سے نکالنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ جانتے تھے کہ نوری اس لمحے اس طرح کیوں بیٹھی ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ جب انسان کچھ بھی نہ کر سکتا ہو تو خاموش رہنے کے سوا وہ اور کیا کر سکتا ہے؟ آٹا کل رات ہی ختم ہو گیا تھا۔ صبح اور دوپہر کو اُن دونوں نے مٹھی بھر کھجور اور مکئی کے بھنے ہوئے دانوں پر گزارا کیا تھا۔ نوری کا جھکا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ اب گھر میں کچھ بھی نہیں رہا ہے۔

نوری بیٹھی رہی وہ بیٹھے رہے۔ ان کے درمیان خاموشی کی الگنی کھنچی رہی اور اس پر نہ بولے جا سکنے والے جملوں کے کٹے پھٹے ٹکڑے پھڑپھڑاتے رہے۔ چراغ کی لو پر پتنگوں کا رقص جاری رہا۔ یہ روشنی دیکھتے ہی جانے کہاں سے چلے آتے ہیں اور اتنے ذوق شوق سے مرتے چلے جاتے ہیں جیسے مر جانے ہی میں ان کی زندگی ہو۔ اپنے خیال پر انہیں جھرجھری سی آ گئی۔

خاموشی جب ناقابل برداشت ہو گئی تو نوری اٹھی اور دالان سے باہر چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس کی چوڑیاں بھی خاموش رہی تھیں۔ دل گرفتگی نے انہیں نڈھال کر دیا۔

اُنہیں وہ دن یاد آئے جب وہ ماسٹر فیض بخش کہلاتے تھے اور جوانی کے منہ زور گھوڑے پر اُن کی سواری نئی نئی تھی۔ بہت سے دوسرے سرپھرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی آزادی کی پری پر فدا تھے اور یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کا جانا اور اس پری کا ہاتھ آنا بس مہینوں اور دنوں کی بات ہے۔ اُن دنوں وہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد سکھر کے ایک اسکول میں تاریخ پڑھاتے تھے اور شاگردوں کو صحیح تاریخ پڑھا کر ہندوستان کی تاریخ بدل دینا چاہتے تھے۔

وہ جب کلاس روم میں کھڑے ہوتے اور شاگردوں کی متجسس، ذہین اور حیران نگاہیں اُن پر جمی ہوئی ہوتیں تو نصاب کی کتاب میں لکھے ہوئے لفظ ان کی نگاہوں کے سامنے

سے چڑیاں بن کر اڑ جاتے۔ فتح سندھ پڑھاتے ہوئے ان کا دل باڑھ پر آئے ہوئے سندھو کی طرح کناروں سے چھلک پڑتا اور وہ بھول جاتے کہ نصابی کتابوں کے صفحوں پر انگریز فاتحین کے بارے میں کیا کیا قصیدے لکھے ہیں۔ قلعہ امام گڑھ کی فتح، جنگ میانی اور دوسری جنگیں پڑھاتے ہوئے وہ کرنل سر الیگزنڈر برنس، سر چارلس جیمز نیپئر اور سر ہنری بارٹل، ایڈورڈ فریئر کی بدعہدیاں، سازشیں اور محلاتی ریشہ دوانیاں بیان کرنے لگتے۔

میرانِ سندھ کی شکست کا داغ ان کا سینہ جلاتا تھا۔ بیگمات میرانِ حیدرآباد کی وہ عرض داشت انہیں نوک بر زبان تھی جو انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کو ارسال کی تھی۔ اپنے شاگردوں کو یہ عرض داشت سناتے ہوئے وہ جب ان سطروں پر پہنچتے کہ "ہم لاچار خواتین زور و قوت سے محروم سر چارلس نیپئر کی آمد کے وقت اپنے محلات میں مقیم تھیں۔ خدا جانے یہ کون سی شرافت تھی کہ وہ ہماری رہائش گاہوں میں داخل ہو گیا اور ہمیں اس طرح لوٹا کہ زندہ رہنے کے واسطے ایک تنکا نہ چھوڑا۔ پورے دو سال گذر چکے ہیں کہ جب اس نے ہم کو اپنے مکانات اور آبائی شہر سے بے گھر کیا اور مجبور کیا کہ ہم حیدرآباد سے باہر جھونپڑیوں میں شل خانہ بدوش کے رہیں۔" تو اُن کی آواز گلوگیر ہو جاتی اور اپنے آنسو وہ بمشکل ہی پیتے۔

اسی طرح حکومت انگلیشیہ کا وہ اشتہار تھا جو میر علی مراد خاں کی معزولی کے لئے جاری کیا گیا تھا اور جسے ان کی رعایا میں تقسیم کیا گیا تھا جس کی اختتامی سطریں انہیں آج بھی یاد تھیں کہ "لہٰذا حکومت انگلیشیہ اعلان کرتی ہے کہ میر مراد علی خاں کو ان کے عہدۂ ریاست سے برطرف کیا جاتا ہے اور تمام ملک سوائے اُس علاقے کے جو میر سہراب خاں سے انہیں وراثت میں ملے ہیں انگریزی علاقے میں شامل کیا جاتا ہے۔ پس تمام رعایا جو اُن علاقوں میں رہتی ہے، وہ آئندہ سے اپنے آپ کو انگریزی حکومت کی رعایا سمجھے اور اس کے احکام و قانون کی پابندی کرے تو اُسے کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا۔"

یہ اور اسی قسم کی توہین آمیز دوسری دستاویزات کا ایک ایک لفظ انھیں ڈستا تھا اور اس قلبی اذیت اور ذہنی کرب کا اظہار وہ اپنے شاگردوں کے سامنے اور ساتھی استادوں کے درمیان بیٹھ کر کرتے تھے یہ باتیں بھلا کس کی چھپی ہیں جو اُن کی ڈھکی چھپی رہتیں۔ چند سال اسی طرح گذر

گئے لیکن پھر باتیں اسکول کے احاطے سے باہر نکلنے لگیں انہی دنوں اُن کا اٹھنا بیٹھنا بھی اُن لوگوں میں زیادہ ہونے لگا جو انگریزی حکومت کے دشمن جانی تھے اور کھلم کھلا برا کہتے تھے۔

بات اُڑتی اُڑتی محکمہ تعلیم کے اعلیٰ افسران تک پہنچی اور پھر ایک روز ڈائریکٹر تعلیمات کے دفتر میں ان کی طلبی ہوئی، ماسٹر فیض بخش جوانی کے جوش میں بھرے ہوئے اور مصلحت کی رسیوں سے بندھے ہوئے وہاں پہنچے، سوال شروع ہوئے تو انہوں نے بہت گھما پھرا کر جواب دیئے لیکن انگریز ڈائریکٹر جب اس حقیقت کو پا گیا کہ بات وہی درست ہے جو اُس تک پہنچی ہے تو دھیمے لہجے میں باتیں کرکے اُس نے انہیں رخصت کر دیا۔

ماسٹر فیض بخش انگریز کی رگ رگ سے واقفیت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اُسے نہیں جانتے تھے۔ وہ اس ملاقات سے خاصے مطمئن ہو کر گھر کو آئے۔ اس رات گھر کے آنگن میں لیٹ کر وہ دیر تک سات ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھتے رہے اور تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں۔ شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں، گنگناتے رہے۔ ستاروں کا غبار جب ان کی آنکھوں، یعنی خوابوں کی دھند بن کر اترنے لگا تو انہوں نے کروٹ بدل کر اُسے دیکھا جس کا سونلایا ہوا نمکین بدن ان کی خواہشوں کا رمنا تھا اور وہ اسکی سیر کو نکل گئے۔

کئی دن گزر گئے۔ انگریز ڈائریکٹر کی طلبی نے جو خلش پیدا کی تھی وہ ذہن کے کسی دور افتادہ گوشے میں جا سوئی۔ اُس روز جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علموں کو کلکتہ کے بلیک ہول کے بارے میں پڑھا کر اور اس فسانے کی حقیقت انہیں سمجھا کر نمٹے تو اسکول کی چھت پر چلے گئے کیونکہ ان کا اگلا گھنٹہ خالی تھا۔ چھت سے انہیں قدرے دوری پر بہتا ہوا سندھو نظر آ رہا تھا، سنہری دھوپ سندھو کی لہروں میں رل مل گئی تھی، شہر کے در و دیوار سے لپٹی تھی اور ہواؤں میں دوپہر کے تپتے ہوئے پنڈے کی نمکین خوشبو تھی۔ زندگی خوبصورت تھی اور آئندہ بھی خوبصورت رہنے کے تمام امکانات رکھتی تھی۔

تب چپڑاسی والا انہیں ڈھونڈتا ہوا چھت پر چلا آیا ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں بلایا تھا وہ بوسکی کی قمیص کے اُن دو اوپری بٹنوں کو بند کرتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگے جنہیں انہوں نے گرمی کے سبب چھت پہ پہنچ کر کھول دیا تھا وہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں پہنچے تو خاکستری رنگ

کا ایک لفافہ ان کا منتظر تھا۔ اس لفافے میں ان کی برطرفی کا پروانہ تھا۔

انگریزی میں ٹائپ شدہ چند سطروں نے ماسٹر فیض بخش کی زندگی کے زمین و آسمان بدل دیئے۔ شروع شروع میں تو انہیں یہی خیال رہا کہ خدا کا شکر ہے انگریز کی غلامی سے نجات ملی لیکن غلامی سے نجات پانے کی جو قیمت انہوں نے ادا کی تھی، وہ جلد ہی ان کی استطاعت سے زیادہ ثابت ہونے لگی۔ وہ تنہا ہوتے تو انہیں ذرا سی بھی الجھن نہ ہوتی لیکن دو برس کی بیاہی ہوئی بیوی اور چند مہینوں کی نوری ان کے لئے سزا بن گیئں۔ پیڑھیوں کی غربت نے قناعت پسندی کو لوگوں کے مزاج کا حصہ بنا دیا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ ماسٹر فیض بخش کے پاس چند گھنٹے زمین بھی نہ تھی کہ جس پر ہل بیل لے کر کھڑے ہو جاتے اور سال بھر کا اناج اگا لیتے۔

انہوں نے سکھر سے حیدرآباد تک بہت بھاگ دوڑ کی، پرائیویٹ ہائی اسکول تو ایک طرف رہے، پرائمری اسکولوں کی دہلیز کی بھی دھول لے ڈالی لیکن ملازمت ان کے لئے مینہ سے بھرا ہوا وہ بادل بن گئی جو بھولے سے بھی صحرا پر سے نہیں گزرتا۔

اُن کا اٹھنا بیٹھنا، عبیداللہ سندھی کے چند معتقدوں میں بھی تھا۔ یہ لوگ دوسروں کے لئے عجوبہ تھے کیونکہ جب دیکھو ٹین کا بکس اٹھائے اور دری میں تکیہ لپیٹے ہوئے سفر کے لئے تیار رہتے تھے۔ اُنہی میں سے ایک شیخ عبدالقدوس تھے وہ ریشمی رومال، تحریک سے وابستہ رہے تھے۔

انھوں نے ایک مرتبہ ماسٹر فیض بخش کو بتایا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اُس زعفرانی ریشمی رومال کو دیکھ چکے ہیں جو بطور خط بھیجا جانے والا تھا۔ جس پر عربی عبارت، مولوی عبیداللہ سندھی نے خود اپنے ہاتھوں سے کاڑھی تھی اور جسے انہوں نے اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی اور اپنے معتمدِ خاص شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی کے سپرد کیا تھا شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی اس رومال نما خط کو کسی معتبر حاجی کے ذریعے شیخ الہند کو حجاز بھجوانے والے تھے کہ اپنوں نے مخبری کی رومال فوج کے ہاتھ لگا، اور اس پر کاڑھی ہوئی کابل کے راستے ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو ہندوستان پر حملے کے منصوبے کی تفصیلات کو کیڑوں نے کھایا۔

شیخ عبدالقدوس سے ماسٹر فیض بخش کو ربط خاص تھا، جب انھوں نے اپنی پریشانی کئی بار شیخ عبدالقدوس سے بیان کی تو انہوں نے ماسٹر فیض بخش کو سمجھایا کہ سرکاری نوکری سے برطرفی کا

مطلب یہ ہے کہ سرکار تم سے ناراض ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں جان پہچان کے لوگوں میں تو نوکری ملنے سے رہی۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ کچھ دنوں کے لئے سکھر چھوڑ دو اور کسی دور دراز علاقے میں اپنی قسمت آزماؤ۔

سکھر چھوڑنے کا مشورہ سن کر ہی ماسٹر فیض بخش کو گھمیریاں سی آگئیں۔ اب یہ پیمبری وقت بھی ان پر پڑنا تھا کہ روزی روٹی کے لئے اپنی مٹی چھوڑیں، اپنا گھر در ترک کریں اور کسی پرائی زمین پر کسی نئے آسمان کے نیچے جا کر رہیں۔ انہوں نے اس مشورے سے گھبرا کر ہفتوں شیخ عبدالقدوس کے گھر کا رُخ ہی نہیں کیا لیکن مانگے تانگے کی روٹی پر بھلا کب کسی کی زندگی گزری ہے جو ماسٹر فیض بخش کی گزرتی۔ چند ہی دنوں میں گھر کے در و دیوار سے بھوک کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ سفید لٹھے کی شلوار پر ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیض اور اس پر زین کا کوٹ پہننے والے خوددار اور خود شناس ماسٹر فیض بخش کا سارا وجود ان لپٹوں سے جھلسنے لگا۔

آخر کار ایک شام جب دوسرے گھروں میں چراغ جل اٹھے تو وہ سر جھکائے ہوئے اپنے گھر سے نکلے اور شیخ عبدالقدوس کے پاس جا پہنچے، شیخ عبدالقدوس نے بتایا کہ وہ دو دن بعد سفر پر نکل رہے ہیں، اگر وہ چاہیں تو ان کے ساتھ چل نکلیں، اللہ بڑا سبب الاسباب ہے، کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔

"لیکن شیخ صاحب آخر کچھ تو پتا چلے کہ جانا کہاں ہے؟" ماسٹر فیض بخش نے گھبرا کر شیخ عبدالقدوس کی شکل دیکھی۔

"گھبراتے کیوں ہو، جب یہاں سے چلو گے تب ہی تو کہیں پہنچو گے،" انہوں نے فلسفیانہ انداز میں کہا اور اپنے قلم میں قط لگانے میں مصروف ہو گئے۔

ماسٹر فیض بخش تھوڑی دیر سر جھکائے ان کے پاس بیٹھے رہے پھر منہ لٹکائے ہوئے گھر واپس آ گئے وہ تمام رات انہوں نے جاگتے ہوئے اور اپنے گھر کے آنگن میں ٹہلتے ہوئے گزار دی۔ یہ مکان بھی اب انہیں جلد ہی خالی کر دینا تھا کیونکہ کئی مہینے سے وہ اس کا کرایہ نہیں دے پائے تھے۔ اُس رات سات ستاروں کا جھمکڑا آسمان پر چمکتا رہا اور منتظر رہا کہ وہ اُسے نگاہیں اُٹھا کر دیکھیں لیکن نہ انہوں نے بناتِ النعش گروہوں کی طرف دیکھا اور نہ اُن کے قدم اُس ہر

بھرے جنگل کی طرف لٹھے ہو اُن کا رمنا تھا۔

صبح ہوئی تو وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔ بیوی کو جب انہوں نے اپنا فیصلہ سنایا تو پہلے تو وہ بڑبڑاتی رہی پھر بیزاری سے سامان سمیٹنے لگی۔ سکھر کے اِس گھر میں اُس نے چودھرانیوں والی زندگی گزاری تھی، اور اب اس سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے۔

دوپہر تک گھر کا سارا اسباب بندھ گیا ماسٹر فیض بخش نے وہ سامان دو بیل گاڑیوں پہ لدوایا اور بیوی اور بیٹی سمیت اپنے گاؤں کا رخ کیا جو سکھر سے کچھ فاصلے پر تھا اور جہاں دو کمروں کا ایک آبائی گھر ان کا منتظر تھا۔ رات گئے وہ گاؤں پہنچے۔ جیسے تیسے سامان گھر میں اتارا بیوی کے ہاتھ پر چند روپے رکھے جو کسی دوست سے ادھار مانگ کر لائے تھے اُس سے جلد ہی منی آرڈر بھیجنے کا وعدہ کیا اور منہ اندھیرے ایک بیل گاڑی میں اپنا بکس اور بستر رکھ کر واپس سکھر کا رخ کیا دوسری بیل گاڑی والا اُسی کے گاؤں کا تھا اور اپنے پیسے لے کر چند دنوں کیلئے وہیں رک گیا تھا۔

بیل گاڑی سکھر شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو سورج سوا نیزے پر تھا انہوں نے بیل گاڑی والے کو شیخ عبدالقدوس کے گھر کا پتا بتایا اور جب گاڑی ان کے دروازے کے سامنے رک گئی تو ماسٹر فیض بخش نے گاڑی سے اتر کر اپنا مختصر سا سامان اتار کر گلی میں رکھا، بیل گاڑی والے کو محنتانہ دیا اور جب وہ رخصت ہو گیا تو شیخ عبدالقدوس کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

دروازہ کھلا تو بنیان اور شلوار پہنے ہوئے مسواک کرتے ہوئے شیخ عبدالقدوس اُن کے سامنے کھڑے تھے اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"میں آ گیا ہوں" ماسٹر فیض بخش نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ شیخ عبدالقدوس نے سر ہلایا اور گھر کا دروازہ پورا کھول دیا۔ ماسٹر فیض بخش نے اپنا سامان اٹھا کر گھر کے آنگن میں رکھا اور خود بھی اندر آ گئے۔

اُس روز بعد دوپہر وہ دونوں ریل سے روانہ ہوئے۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس کا شاید کوئی انت نہ تھا کم از کم ماسٹر فیض بخش کو تو یہی محسوس ہونے لگا تھا۔ شیخ عبدالقدوس مختلف شہروں میں رکتے رکاتے، مسجدوں کے حجروں میں ٹھہرتے ہوئے، سراؤں میں قیام کرتے ہوئے تقریباً ایک مہینے بعد دلی پہنچے۔ دلی پہنچ کر شیخ عبدالقدوس نے محلہ سوئی والاں کا رُخ کیا اور وہاں محنتی پرائیویٹ اسکول

میں جا اُترے۔ مولانا حالی کے بیٹے ماسٹر احمد علی خاں اس کے روح رواں تھے۔ کئی دن تک شیخ عبدالقدوس ان کے ساتھ جانے کہاں کہاں آتے جاتے رہے، ماسٹر فیض بخش درگاہ نظام الدین اور دوسرے مزاروں پر حاضری دیتے رہے، ہر جگہ گریہ کیا، ہر مقام پر دست بدعا ہوئے، گھر کی، بیوی اور نوری کی یاد سینے میں برما چلاتی رہتی تھی۔ جو روپے بیوی کے ہاتھ پر رکھ کر چلے تھے وہ تو اب ختم ہو چکے ہوں گے، وہ نیک بخت کیا کر رہی ہوگی، گزر گزران کیسے ہو رہی ہوگی۔ یہی خیالات انہیں ہر وقت بیکل رکھتے لیکن دلی پہنچ کر انہیں قدرے اطمینان ہو گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ محنتی پرائیویٹ اسکول میں مدرس ہو جائیں گے۔ لیکن جب شیخ صاحب نے وہاں سے بھی رختِ سفر باندھا تو ماسٹر فیض بخش گھبرا گئے۔

"شیخ سائیں اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"ہم کیا اور ہمارا ارادہ کیا۔ اللہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے، ہماری ایک ایک حرکت اُسی کے تابع ہے۔ ہم تو بس چلتے رہیں گے پھر اشارہ جہاں کا ہوگا وہیں ٹھہر جائیں گے۔"

ماسٹر فیض بخش نے یہ سن کر سر جھکا دیا۔ انگریزی تعلیم اُن کے اندر کے صوفی کو ختم نہیں کر سکی تھی اور اب چند مہینوں سے وہ جس ابتلا میں گرفتار تھے اُس نے انہیں تصوف کی طرف کچھ اور بھی زیادہ مائل کر دیا تھا۔

اسٹیشن پہنچ کر شیخ صاحب نے ماسٹر فیض بخش کو مختصر سے سامان کے پاس کھڑا کیا اور لپک کر جانے کہاں کے دو ٹکٹ بنوائے اور اپنی جیب میں رکھ لیے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگی تو دونوں تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں براجمان ہو گئے۔ ریل چلی اور چلتی ہی چلی گئی۔ اسٹیشن آتے رہے، ریل رکتی رہی لیکن شیخ صاحب نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی، ماسٹر فیض بخش کا دل ہر کوس پر ڈوبتا رہا۔ شاید انہوں نے شیخ صاحب کا ساتھ پکڑ کر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ اجنبی ماحول، اجنبی لباس، اجنبی زبان، ہر لحہ وہ اپنے گھر سے اپنی زمین سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔

گاڑی لکھنؤ کے چار باغ اسٹیشن میں داخل ہوئی، ماسٹر فیض بخش نے اسٹیشن کی عمارت کو دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔ یہ اسٹیشن کی عمارت کاہے کو تھی، راجہ کا محل تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر ٹہل ٹہل کر عمارت کو مختلف زاویوں سے

دیکھتے رہے، لوگوں کے مترنم لہجے کو سنتے رہے اور لوگ انہیں دیکھتے رہے

لکھنؤ سے گاڑی روانہ ہوئی تو شیخ عبدالقدوس نے بتایا کہ ان کی منزل کانپور ہے اور دو اسٹیشنوں بعد کانپور آجائے گا، ماسٹر فیض بخش نے کانپور کا نام تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ جنگ آزادی کے دوران میں یہ شہر نانا صاحب نے بڑے زبردست معرکے کے بعد فتح کیا تھا، انگریزی قبضے سے چھڑا دیا تھا۔ یہ بھی وہ جانتے تھے کہ وہاں اسلحہ بنانے کی فیکٹری ہے۔ اس کے آگے ان کی معلومات کا خزانہ خالی ہو جاتا تھا۔

وہ کھڑکی سے گردن نکال کر بیٹھ گئے۔ سرسبز منظر ان کی نگاہوں کے صحرا میں اڑتے ہوئے تیتر کی طرح لحظے بھر کیلئے نمودار ہوتے اور پھر کہیں دور نکل جاتے۔ اُناؤ کا اسٹیشن آیا اور پھر گمردارے کا۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ گمردارے ہی سے پرانے کانپور کے آثار شروع ہو جاتے ہیں اور یہ بھی کہ عوام الناس کانپور کو، کمپور کہتے ہیں، ریل پل پر سے گزرنے لگی تو ماسٹر فیض بخش نے گنگا کے پاٹ کو دیکھا جو دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور بہت ہی چوڑا تھا۔

اسٹیشن پر اتر کر شیخ صاحب نے تانگہ کیا اور تانگے والے کو گوال ٹولی چلنے کو کہا، گوال ٹولی میں وہ جن صاحب کے ہاں اُترے اُن کا نام حمید الدین تھا، وکیل تھے، دیوانی مقدمات لڑتے تھے اور شیخ عبدالقدوس کے بہت معتقد تھے۔

شیخ صاحب گوال ٹولی میں وکیل صاحب کے ہاں ٹھہرے اور دوسرے ہی دن سے ماسٹر فیض بخش کو ساتھ لے کر روزانہ حلیم ہائی اسکول کا چکر لگانے لگے۔ وہاں انھوں نے جادو کی جانے کون سی ایسی چھڑی گھمائی کہ کانپور پہنچنے کے چھٹے دن ماسٹر فیض بخش حلیم ہائی اسکول میں تاریخ اور فارسی پڑھانے پر مقرر ہو گئے جس روز تقرری کا پروانہ ملا ہے۔ شیخ صاحب نے اس روز ماسٹر فیض بخش کو تنہا اسکول بھیجا تھا۔ تقرری کا پروانہ ماسٹر فیض بخش کے ہاتھ میں آیا تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا پھر جب یقین آیا تو انہوں نے گھر پہنچ کر شیخ عبدالقدوس کے قدم چھونے چاہے۔

"اللہ کے ایک گنہگار بندے کو مزید گنہگار کیوں کرتے ہو" شیخ صاحب نے یہ کہتے ہوئے اپنے پیر پلنگ سے اتارے، کھڑاؤں میں ڈالے اور سر پر زرد رنگ کا چارخانہ رومال لپیٹتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے "ذرا ایک تانگہ تو پکڑنا"

ماسٹر فیض بخش لپک کر تانگہ لائے تو دیکھا کہ شیخ عبدالقدوس کا ٹین کا بکس اور بستر گلی میں رکھا ہے اور وہ اپنا تن و توش سنبھالتے ہوئے وکیل صاحب کے گھر سے نکل رہے ہیں۔

"خیریت سائیں؟" ماسٹر فیض بخش نے گھبرا کر پوچھا۔

"بس اب ہم چلے، اب وہ دانہ اٹھ گیا یہاں سے"

"لیکن کہاں شیخ سائیں؟"

"یہ، کہاں، کون سا مقام ہے نقشے میں دیکھ کر رکھنا" شیخ صاحب نے اپنا ٹین کا بکس اٹھاتے ہوئے کہا اور ماسٹر فیض بخش نے اُسے ان کے ہاتھ سے تھام لیا اور تانگے میں رکھ دیا۔

"وکیل صاحب کا انتظار تو کر لیتے سائیں"

"فقیر صرف موت کا انتظار کرتے ہیں، آدمیوں کا نہیں" انہوں نے تانگے کے پائیدان پر پَیر جمایا اور سنبھل کر چڑھ گئے، ان کے بیٹھتے ہی تانگے والے نے تانگہ بڑھایا، آن کی آن میں تانگہ گلی سے نکل گیا بس گھوڑے کے سموں سے اڑنے والی دھول رہ گئی۔

ماسٹر فیض بخش کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ شیخ عبدالقدوس تھے تو جیسے گھر ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اپنی زمین پَیروں کے نیچے تھی اور اپنا آسمان سر کے اوپر تھا۔ اُنہیں کپکپی سی چڑھنے لگی۔ وکیل صاحب کچہری سے آئے تو ماسٹر فیض بخش نے انہیں شیخ صاحب کے جانے کی خبر سنائی، حمیدالدین وکیل سر ہلا کر رہ گئے۔ وہ شاید شیخ صاحب کی اچانک آمد اور اس سے بھی زیادہ فوری رخصت کے عادی تھے۔ پھر ماسٹر فیض بخش نے اپنا تقرری کا پروانہ وکیل صاحب کو دکھایا اور عرض کی کہ اگر مستقل رہائش کا بھی کوئی بندوبست ان کے توسط سے ہو جائے تو... وکیل صاحب نے یہ سن کر بھی اُسی طرح سر ہلایا جس طرح شیخ صاحب کے جانے کی خبر پر ہلایا تھا اور خاموشی سے اٹھ کر زنان خانے میں چلے گئے۔

دوسرے روز وکیل صاحب کچہری جاتے ہوئے انہیں بھی ساتھ لے گئے۔ دوپہر تک ماسٹر فیض بخش کے لئے پھول باغ میں رہائش کا انتظام ہو چکا تھا۔ یہ بھی ایک وکیل صاحب کا گھر تھا، گھر کے پچھواڑے ایک کمرہ اور بیت الخلا تھا، اظہار الحق صاحب وکیل نے یہ حصہ ماسٹر فیض بخش کو چند روپوں میں کرائے پر دے دیا۔ وہ اسی شام اپنے گھر میں منتقل ہو گئے اور دو

دن بعد انہوں نے حلیم ہائی اسکول میں مدرسی شروع کر دی،

روٹی انسان کو اس قدر ذلیل کرتی ہے اور اپنے پیاروں سے اس طرح دور پھینک دیتی ہے، اس حقیقت کا صحیح اندازہ انہیں اب ہو رہا تھا۔ وہ پابندی سے اسکول جاتے، جی لگا کر بچوں کو پڑھاتے لیکن جب ان کا لب ولہجہ اور ان کی وضع قطع کبھی شاگرد کی زیر لب مسکراہٹ اور کبھی کسی ساتھی استاد کے پُر لطف جملے کا سبب بن جاتی تو سینے میں ایک نشتر سا لوٹ جاتا۔

شام ہوتی تو گھر کا خیال ان کی نس نس میں کھٹکنے لگتا اور وہ بیتاب ہو کر گلیوں میں چکراتے پھرتے۔ گنگا کے کنارے پر آباد یہ شہر ان کے لئے ولایت سے کم نہ تھا۔ کہاں کچھ سوتے اور کچھ جاگتے ہوئے سکھر کی ندی کی طرح دھیمے دھیمے بہتی ہوئی زندگی اور کہاں بھنور ڈالتے ہوئے پُرشور دریا ایسا کانپور ٹینریاں، اسلحے کی فیکٹری، کپڑے، تیل، بسکٹ، شکر، صابن اور کیمیکلز کے کارخانے ریلوے کالونیاں، فوجی ہوائی اڈہ، جرنیلی سڑک پر دلی سے کلکتہ اور کلکتے سے دلی کے مسافروں اور اور سواریوں کی ریل پیل، بازاروں میں انسانوں کا اژدہام اور دکانوں میں سامان کی بہتات، آہستہ آہستہ وہ ابھی نئے شہر کے اسیر ہوتے گئے اور پھر ایک روز ان کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی جو آرڈننس فیکٹری میں ملازم تھا اور انقلابی شاعری کرتا تھا۔ چند ہی ملاقاتوں میں دونوں ایک دوسرے سے یوں شیر وشکر ہو گئے جیسے برسوں پرانے دوست ہوں۔

اُس کا اصل نام تو جانے کیا تھا، شعلہ کانپوری کے نام سے مشہور تھا۔ الٰہی وہ بھی دن ہو گا جب اپنا راج دیکھیں گے جب اپنی ہی زمیں ہو گی اور اپنا آسماں ہو گا، ہر وقت اس کے وردِ زبان رہتا۔ شعلہ نے ان کی ملاقات خوشی رام سے کروائی۔ خوشی رام، حیدر آباد کا رہنے والا تھا اور روزگار کی تلاش میں انہی کی طرح بہتا بہتا کانپور آ پہنچا تھا اور ایک دکان پر بہی کھاتہ لکھتا تھا۔

خوشی رام نے چھوٹتے ہی ان سے سندھی میں کلام کیا تو ماسٹر فیض بخش باؤلے ہو گئے، ارے میرے سوہنے سائیں، تو تو واقعی خوشی رام ہے، انہوں نے اُسے سینے سے لگایا، اُس کے رخسار چومے اور خلاف عادت اس کے کندھوں پہ ہاتھ مار کر آواز بلند ہنستے چلے گئے، خوشی رام سے ملاقات کے بعد ان کے سر پہ پھر اپنا آسمان چھا گیا اور پیروں کے نیچے نئی زمین بچھ گئی۔

شعلہ کانپوری اور خوشی رام ایک دوسرے کے یار غار تھے۔ پہلے تو ماسٹر فیض بخش کی سمجھ میں

دونوں کی اتنی گہری دوستی کا سبب نہ آیا لیکن جب وہ ان دونوں کے قریب آتے گئے، ان کے
دوسرے دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا بڑھا تو آہستہ آہستہ ایک نیا منظر نامہ اُن کی نگاہوں کے سامنے کھلتا
چلا گیا۔ اس منظر نامے کے کرداروں میں بنگالی بھی تھے، بہاری بھی، پنجابی بھی تھے اور تامل بھی،
کچھ نوجوان کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ گوا کے عیسائی تھے۔ ان سرپھروں سے مل کر ماسٹر فیض بخش
کو یوں محسوس ہوا جیسے مختلف علاقوں سے آنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے یہ سب
لوگ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر جلد ہی وہ خود بھی اس خاندان کا ایک
فرد بن گئے یہ اُتر پردیشی انقلابیوں کی بنائی ہوئی ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن
تھی۔ اس میں کیسے کیسے نام تھے، وہ نام جو تاریخ کا حصہ بن گئے۔

گزرے ہوئے زمانوں کے بارے میں سوچتے ہوئے سائیں فیض بخش کے خون میں بھنور سا
پڑا۔ اُن کا نام بھی ان ناموں کے ساتھ تاریخ کا حصہ بن سکتا تھا لیکن تاریخ اپنے صفحوں پر نام لکھوانے
والوں سے دان مانگتی ہے۔ جسم و جاں کا دان، رشتوں اور جذبوں کا دان۔

اُن دنوں اکثر وہ اپنے بارے میں سوچتے۔ فرنگی سے انہیں بھی دلی نفرت تھی، اتنی نفرت
کہ وہ اپنی سرکاری ملازمت سے برطرف ہوئے تھے اور وطن سے سینکڑوں میل دور دو روٹیاں
کمانے کی خاطر پڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی آزادی کے خواب دیکھتے تھے پھر وہ کیا بات تھی کہ جس
نے ان نوجوانوں کی طرح انہیں دہشت پسند نہ بننے دیا۔ بہت غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر
پہنچے تھے کہ شاید انقلاب کی آگ ابھی ان کے اندر اتنی نہیں دہکی کہ اُس بھٹی میں پرانے رشتے پگھل
جائیں اور نئے رشتوں میں ڈھل جائیں اور شاید یہ بھی تھا کہ وہ اپنے اندرون میں صوفی تھے وہ
حضرت ابوالحسن نوریؒ کے معتقد تھے اور اس قول پر ان کا ایمان تھا کہ، تصوف ایک ایسی آزادی
ہے کہ بندہ قیدِ حرص سے آزاد ہو جاتا ہے اور تصوف تکلفات کا ایسا ترک کر دینا ہے کہ بندہ ہر
متعلق اور مقسوم کے اندر خوش رہتا ہے اور تصوف ایک ایسی سخاوت کا نام ہے کہ دنیا اہل دنیا
پر ہی چھوڑ دیتا ہے اور خود بے تعلق ہو جاتا ہے،

اس قول پر ایمان رکھنے کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی قوت نہیں پاتے تھے کہ اس قول
کی تصویر بن جائیں اور ترک کی مختلف منزلوں سے گذر جائیں جب وہ اپنے آپ کو نہ مکمل انقلابی

پاتے تھے اور نہ پورے صوفی تو ان پر جھنجھلاہٹ طاری ہو جاتی۔ ایسے عالم میں وہ گنگا کے کنارے گھنٹوں تنہا ٹہلتے جاتے اور بہادر علی شاہ ساقی کا مصرع، بتا اے مرغِ دل تو نے کہاں اپنا وطن چھوڑا، گنگناتے جاتے۔ دل کی اداسی کا رنگ جب گہرا سرمئی ہو جاتا تو کپڑے کنارے پر رکھ کر دریا میں اتر جاتے اور سرمئی اداسی کو گنگا کے پوتر پانی سے دھونے کی کوشش کرتے۔ خواہش کے باوجود وہ نہ کھرے انقلابی بن پائے تھے۔ اور نہ سچے صوفی۔ وہ ہر مہینے پابندی سے بیوی کے نام منی آرڈر بھیجتے، ہفتے دو ہفتے میں اسے خط لکھتے جو محض خیریت ہی پر مشتمل ہوتا تھا کیونکہ اُن کا بھیجا ہوا پوسٹ کارڈ ان کی بیوی خود نہیں پڑھ سکتی تھی، ان دو ذمہ داریوں سے نمٹ کر باقی وقت وہ ان نوجوانوں کے ساتھ گزارتے جنہیں پارٹی فنڈ سے روزانہ کے اخراجات کے لئے صرف ایک چونی ملتی تھی اور جن پر انہیں رشک آتا تھا یہ لڑکے اپنے گھر در چھوڑ کر خان بہادروں اور رائے بہادروں کے پروردہ منصب داروں کی ناک کے نیچے پمفلٹ بانٹتے، تھانوں پر بم مارتے، ریل کی پٹڑیاں اکھاڑتے، کندھوں پر لئی کا کنستر رکھے ہاتھوں میں قلعی گروں والی کوچی لئے دیواروں پر پوسٹر چپکاتے پھرتے اور جب موج میلے کا جی چاہتا تو رکشے والوں اور تانگے والوں کے ساتھ بیٹھ کر فلمیں دیکھتے، بھُنے ہوئے چنے کی پھنکی مارتے، میونسپلٹی کے نل سے پانی پیتے اور بیٹھ کر کوئی فرنگی گزرتا ہوا نظر آتا تو، میرا رنگ دے بسنتی چولا، اسی رنگ کے شوا نے ماں کا بندھن کھولا، میرا رنگ دے بسنتی چولا، گاتے ہوئے اور اینڈتے ہوئے گزر جاتے۔

یہ لڑکے راجپوت نہ تھے لیکن ان کی طرح کیسری بانا پہنے، جوہر کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان دنوں کالوری کیس کا شہرہ تھا۔ اشفاق اللہ خان، رام پرساد بسمل، روشن سنگھ لاہڑی، پھانسی کے تختے پر دولہا بننے والوں کے ناموں کی ایک کہکشاں تھی جس کی چھوٹ سے تمام ہندوستان جگمگا رہا تھا۔

اُن کے صوفیانہ مزاج کے باوجود خوشی رام نے انہیں اس حد تک سرگرم تو کر ہی دیا تھا کہ اب وہ کانپوری کلرکوں اور بیوپاریوں کے بچوں کو تاریخ اور فارسی پڑھانے کے ساتھ ہی چندر شیکھر آزاد، وجے کمار سنہا، سکھ دیو اور دُرگا دیوی کے پیغامات متعلقہ لوگوں کو پہنچاتے تھے اور نہایت کامیاب "کوریئر" ثابت ہوئے تھے۔

وہ عجب دن اور عجب راتیں تھیں۔ دن اسکول میں کتابوں، کاپیوں، ذہین اور کند ذہن

شاگردوں اور عنبی ساتھیوں کے درمیان گزرتا، شام ہوتی تو خوشی رام اپنا ہی کھانا نمٹا کر ان کے پاس آجاتا پھر وہ دونوں دوسرے دوستوں سے ملنے کے لئے چل دیتے۔ خوشی رام کی آواز بہت دلکش اور پُرسوز تھی، آسمان جب نارنجی سے سرمئی ہونے لگتا اور ہواؤں میں جب پھولوں کی خوشبو کھلنے لگتی تو وہ مست ہو کر باآواز بلند گانا شروع کر دیتا۔ شاہ کی کافیاں، سچل کا کلام، سوبھا فقیر کی ایک کافی اُسے بہت محبوب تھی جس کا تھلہ نظیر اکبر آبادی کے مشہور مصرعے کی تضمین تھی، سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ، سب غمزے رمزے چل گئے ٹھڑے راجل کون رجھاوے گا، آوت جاوت چل گئے راگت، بینت کون بجاوے گا۔ دھانت خیانت، چل گئی امانت سوبھل کون سڑاوے گا؛

اُس کی آواز کا بکھیر و جب ماسٹر فیض بخش کی سماعت میں اُڑان بھرتا تو اُن کی نس نس جانے کس کے ہجر میں ہرن کی کچی اور دھوپ کھائی ہوئی کھال کی طرح تڑخنے لگتی، تانا ناہو یا ہو، تانانا ہو یا ہو۔ اور کبھی کبھی تو ہجر کا پرندہ سینے میں اس بیقراری سے کٹکٹاتا کہ جیسے ہڈیوں کا پنجرہ توڑ کر ابھی باہر آجائے گا، تب وہ کسی درگاہ کسی تکیئے میں جا بیٹھتے اور محفل سماع میں شریک ہو کر گھنٹوں ایک ہی مصرعے کے مفاہیم کی شناوری کرتے۔

خوشی رام شعلہ کانپوری اور بعض دوسرے انقلابی دوست ان کی اس روش پر شور مچاتے انہیں مولوی فیض بخش قدس سرہٗ اور حضرت مولانا فیض بخش نوراللہ، کے ناموں سے پکارتے تو وہ دوستوں کی اس چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہوتے؛

ان کا کہنا تھا کہ انقلابی اپنی بنیاد میں دراصل صوفی ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خدا میں ضم ہو جانے کی خواہش اور انقلاب کے لئے جان سے گزرنے کی آرزو، نفس کی ایک ہی حالت کے دو رخ ہیں۔ صوفی خدا کے عشق میں گرفتار ہو کر اس کے لئے فنا ہو جانا چاہتا ہے اور انقلابی، انقلاب کے لئے فنا ہوتا ہے۔ دونوں ہی گرفتارِ محبت ہیں اور محبت وہ شے ہے کہ جس ظرف یعنی دل میں رکھی جاتی ہے، اُسے اللہ تعالیٰ نے جسم سے سات ہزار سال پہلے پیدا فرمایا اور مقامِ قرب میں رکھا؛

دوستوں میں ان کے فلسفے کا خوب مذاق اڑتا لیکن مذاق اڑانے والے جانتے تھے کہ یہ نقطہ

نظر رکھنے کے باوجود ماسٹر فیض بخش کس قدر، قابل اعتبار ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مشکل سے مشکل مقام پر پیغام پہنچانے کے لئے انہی کو منتخب کیا جاتا اور ہر مرتبہ وہ کامریڈوں کے اعتماد پر پورے اترتے۔

کانپوری میں ان کی ملاقاتیں بھگت سنگھ سے ہوئیں۔ اس سے گفتگوؤں کے دوران میں انہیں شدت سے یہ احساس ہوا تھا کہ انگریزوں کے مظالم نے ایک بہت عالم نوجوان کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں اس کے لئے بم بنانے یا بم مارنے اور خونریز انقلاب کے بغیر ہندوستان کی آزادی کا تصور بھی محال ہو گیا ہے۔ وہ کتاب کا کیڑا تھا، انہوں نے اس کے تھیلے میں ہمیشہ موٹی موٹی کتابیں بھری ہوئی دیکھی تھیں۔ جب وہ سوشلزم، مارکسزم اور کمیونزم کے بارے میں بولتا تو اتنی بہت سی کتابوں کے حوالے دیتا کہ انہیں اپنے آپ سے شرم آنے لگتی۔ وہ عمر میں اس سے بڑے تھے، تاریخ کے استاد تھے لیکن ان نظریوں اور نظریہ سازوں سے ناواقف تھے۔

کانپور میں انہوں نے پانچ سال گذارے لیکن پھر اچانک گھر انہیں اتنی شدت سے یاد آنے لگا کہ وہ خوشی رام اور شعلہ کانپوری کی ناراضگی مول لے کر اور اسکول سے استعفےٰ دے کر چل پڑے۔ گھر آئے تو مہینوں نوری کے سحر سے نہ نکلے وہ اب چھ سال کی ہو گئی تھی اور اس کی ایک ایک ادا انہیں گریہ ناک کر دیتی تھی۔ پس انداز کئے ہوئے روپے ختم ہونے لگے تو ایک واقف کار کے ذریعے انہیں حیدرآباد کے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی لیکن دو سال میں ہی وہاں سے بھی ان کا جی بھر گیا۔ سینے کے اندر ایک بیقراری سی تھی، کچھ کرنے کی، کچھ بننے کی، لیکن وہ کیا کریں، کیا بنیں، یہ ان کی سمجھ میں آج تک نہ آیا تھا۔

اب وہ کئی برس سے گھر میں تھے، سر پر وقت کا بھبھوت اتنی تیزی سے جما تھا کہ وہ ماسٹر فیض بخش سے سائیں فیض بخش ہو گئے تھے اب ان کی گزران گاؤں کے بچوں کو قرآن پڑھاتے یا سندھی اور اردو پڑھانے پر تھی۔ بعض بچے کنگز ریڈر پڑھنے آتے تھے اور وہ انہیں سی اے ٹی کیٹ اور آر اے ٹی ریٹ، یاد کرواتے تھے۔ فارسی پڑھنے اب کوئی نہیں آتا تھا اور تاریخ سے بھی کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی، کلہوڑہ، سومرو اور ٹالپر خاندان کے شجرہ ہائے نسب کتابوں کے صفحوں میں ملتے تھے اور شہروں میں ابھی تک انگریز کی عملداری تھی۔

نوری کی ماں اس بے سروسامان زندگی سے اتنی ہلکان ہوئی کہ جانبر نہ ہو سکی، مرحومہ زندہ تھی تو گھر میں چار کا بسیرا تھا۔ وہ چلی گئی تو رہ جانے والوں میں خود تھے، نوری تھی اور غربت

اور عزیت ہی اس گھر میں آخر تک رہنے والی تھی۔

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ زندگی اتنی تیزی سے گزر گئی جیسے گزری ہی نہ ہو۔ وہ کچھ دیر تک خالی الذہن بیٹھے رہے پھر انہوں نے مثنوی کا چوتھا دفتر اٹھا لیا۔ اس کے درمیان سے مور کا پر نکالا اور بے ساختہ اسے چوم لیا۔ یہ وہ حسن تھا جسے خریدنے کے لیے سکّوں کی ضرورت نہیں پڑتی تھی جبکہ زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکے ہی کام آتے ہیں۔ پیٹ بھرنے کے لئے، تن ڈھانکنے کے لئے، پیروں میں کچھ پہننے کے لئے، کہیں آنے یا جانے کے لئے۔

انہیں خیال آیا کہ اتنی دیر جو وہ اپنی یادوں میں گم رہے ہیں تو چراغ کا تیل بے سبب جلا ہے۔ وہ اتنے امیر کہاں تھے کہ چراغ میں جلتے ہوئے تیل کو سوچنے میں ضائع کرتے۔ سوچ تو وہ اندھیرے میں بھی سکتے تھے۔

اپنے اس خیال پر پھر وہ خود ہی شرمندہ ہو گئے۔ کیا چراغ میں جلتا ہوا تیل، اس سے پھیلتی ہوئی روشنی اور اس روشنی میں چمکتے ہوئے لفظ، لونری کی بھوک سے زیادہ اہم تھے؟ یہ ایک قاتل خیال تھا۔ وہ اپنے آپ سے گھبرا گئے، انہوں نے دفتر بند کیا پھر وہ اٹھے اور اوطاق کی تنگی میں ٹہلنے لگے۔

ٹہلتے ہوئے ان کی نظر ایک چھوٹی سی پٹاری پر پڑی جو طاق کے ایک کونے میں رکھی تھی اور چراغ کی روشنی میں اس پر جمی ہوئی گرد صاف نظر آرہی تھی۔ انہوں نے اُسے برسوں سے نہیں کھولا تھا۔ اس میں کتنی پرانی یادیں بند تھیں۔ کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس گرد آلود پٹاری میں کیسے کیسے نام سوتے ہیں۔ وہ چند لمحوں تک اُسے غور سے دیکھتے رہے پھر انہوں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اُسے اتار لیا، پھونک مار مار کر اس پر جمی ہوئی گرد اڑائی اور اسے کھول کر بیٹھ گئے۔

اُس میں سکھدیو، چندر شیکھر آزاد اور دُرگا دیوی کے چند خط تھے۔ ہنس راج، وائرلیس کی ڈائری تھی۔ ہنس راج، وائرلیس بھی خوب چیز تھا۔ وہ ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کا بہت اہم ممبر تھا۔ بجلی کے کام میں اسے اتنی مہارت تھی کہ مشکل سے مشکل کام وہ چٹکی بجاتے کر گزرتا تھا، تب ہی دوستوں نے اس کے نام کے ساتھ، وائرلیس کا اضافہ اس سنجیدگی سے کیا تھا کہ وہ ہنس راج کی عرفیت بن کر رہ گیا تھا۔

سائیں فیض بخش اس سے پہلی مرتبہ کانپور ہی میں ملے تھے۔ اُن دنوں وہ کلکتہ، لاہور، امرتسر

اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں بم مارتا پھر رہا تھا۔ وہ کانپور چھوڑ کر حیدرآباد چلے آئے۔ اس دوران میں انہیں اس کے دو تین خط ملے پھر ایک روز اچانک وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا حیدرآباد چلا آیا۔ اُن دنوں وہ وائسرائے کی ٹرین کو بارودی سرنگ سے اڑانے اور دوسرے لاہور کانسپریسی کیس میں پولیس کو مطلوب تھا وہ سائیں فیض بخش کے گھر کئی روز مہمان رہا۔ پولیس اس کی تلاش میں سرگرم تھی، پھر اُن کے منع کرنے کے باوجود وہ وہاں سے چل پڑا۔

جاتے جاتے اس نے اپنی ڈائری اور چند کامریڈوں کے خطوط حفاظت کے خیال سے ان کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ وہ کسی مشن پر تھا اور اسے مکمل کر کے دوبارہ ان کے گھر آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن وہ ڈائری اور خطوط ان کی پٹاری میں آج تک محفوظ تھے، ہنسراج ان چیزوں کو لینے نہیں آسکا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر وہ حیدرآباد کے مضافات میں چلا گیا اور وہاں ایک آٹا مل کے کمپاؤنڈ میں ایک کامریڈ کے گھر ٹھہر گیا۔ وہ گھر اس کے مشن کی تکمیل کیلئے زیادہ مناسب تھا۔ وہاں پہنچنے کے دو ہی دن بعد اُسے اُس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہا تھا اور اپنے خیال میں نہایت محفوظ مقام پر تھا۔

سائیں فیض بخش کو یہ خبر ملی تو وہ کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ ہنسراج سے انہیں ایک خاص تعلق تھا لیکن وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

انہوں نے اس کی ڈائری کی ورق گردانی کی۔ ایک صفحے پر ۱۹۳۰ء لکھا ہوا تھا اور اس کو سرخ روشنائی سے نشان زد کیا گیا تھا۔ سنہ کے نیچے بریکٹ میں لکھا تھا۔ کامریڈ سین کے دورے کے بعد سندھ میں ہونے والے واقعات۔

۱۔ ۱۶ ستمبر۔ کراچی سٹی پولیس اسٹیشن پر بم پھینکا گیا۔

۲۔ ۲۹ ستمبر۔ ریواچند بلڈنگ، کراچی میں بم پھٹا۔ جیٹھانند اور خیرات رام گرفتار ہوئے لیکن ناکافی شہادتوں کی بنیاد پر رہا کئے گئے۔

۳۔ ۹ نومبر۔ کراچی سٹی پولیس اسٹیشن پر ایک بار پھر بم پھینکا گیا۔

۴۔ ۲۵ نومبر۔ کراچی کے ایک گھر سے بم بنانے کا سامان پکڑا گیا۔

۵۔ ۲۸ نومبر۔ حیدرآباد میں سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے کمپاؤنڈ میں بم مارا گیا۔

ان پانچ اندراجات کے بعد کوئی اور واردات لکھی نہیں گئی تھی اور جون ۱۹۳۲ء میں ہنس راج خود ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ جانے ۱۹۳۱ء میں ان لوگوں نے کیا کچھ کیا ہو گا؟ سائیں فیض بخش نے سوچا۔ پھر وہ خطوط کو الٹنے پلٹنے لگے ان میں بہت سے خوشی رام کے خط تھے۔ مٹیالے کاغذوں پر نیلی روشنائی قدرے دھندلا گئی تھی۔ خطوں کے جیب میں زیادہ دنوں تک رہنے اور پسینہ جذب کرنے کے سبب تحریریں پھیل گئی تھیں۔ لفظ کہیں کہیں سے اڑ گئے تھے۔

انہوں نے ایک گہری آہ بھری۔ یہ سب اس زمانے کی یادگاریں تھیں جب وہ تاریخ پڑھاتے پڑھاتے چند گھنٹوں یا چند دنوں کے لئے روپوش مسافروں کے میزبان بن جاتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ تاریخ کا دھارا، امن اور شانتی کی گردان سے موڑا نہیں جا سکتا اور یہ بھی کہ بادشاہوں اور ظالموں سے لڑنے کے لئے اور اپنا حق چھیننے کیلئے تقریروں کی نہیں ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزادی کے پیر خون سے دھلائے جائیں تب ہی وہ لکشمی کی طرح ہر گھر کے آنگن میں جھانجھنیں بجاتی ہوئی اترتی ہے۔ یہ سب کچھ انہیں تاریخ کی کتابوں نے بہت پہلے سکھا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی ان کی طبیعت بم بنانے اور بم مارنے کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ عملی طور پر کچھ نہ کرنے کا کفارہ انہوں نے اس طرح ادا کیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف دہشت پسند سرگرمیاں انجام دینے والوں کے خط ادھر سے ادھر پہنچاتے، کبھی کسی مفرور دہشت پسند کو اپنے گھر ٹھہراتے اور کبھی اپنے تھیلے میں کوئی اشد ضروری سامان، رکھ کر اس پر سے دو چار کتابیں اور طالب علموں کی کاپیاں بھر کر شفیع آباد سے چمن گنج اور ہیلٹ نگر سے مول گنج میں جاتے۔

ان خطوں کو لکھنے والوں میں سے اب کوئی بھی باقی نہیں رہا تھا۔ سب پھانسی گھاٹوں سے ہو کر بسنتی چولا پہن کر سرخ تتلیوں اور آتشیں رنگ جگنوؤں کی تلاش میں چلے گئے تھے وہ اور ان جیسے دوسرے بے عمل اور بزدل زندہ تھے اور آئندہ بھی برسوں زندہ رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

انہوں نے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ کھولا، یہ سنگل لائین اسکول کاپی کا ایک ورق تھا۔ خط پر ۱۲ر اپریل ۱۹۳۱ر کی تاریخ تھی۔ یہ خط انہیں خوشی رام نے لکھا تھا اور ساتھ ہی اس میں بھگت سنگھ کے آخری اشعار بھی نقل کئے تھے، آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی ان کی آنکھیں لفظوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ "اسے یہ فکر ہے ہر دم نیا طرز جفا کیا ہے۔ ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے۔ کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل، چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں" یہ شعر بھگت سنگھ نے پھانسی گھاٹ میں کہے

تھے۔ بسنتی چولا پہننے سے صرف سولہ دن پہلے۔ اُن کے آنسو اُن اشعار پر نثار ہوتے رہے۔

وہ جانتے تھے کہ اگر کسی کو گمان بھی ہو جائے کہ ان کے پاس یہ کاغذات موجود ہیں اور یہ کہ ماضی میں ان کا دہشت پسندوں سے کوئی تعلق بھی رہا ہے تو قید با مشقت ان کا مقدر ہوگی اور در در کی ٹھوکریں نوری کا۔

کسی نے تیز آواز میں کنڈی کھٹکھٹائی۔ ان کا دل ایک لحظے کے لیے تیزی سے دھڑکا۔ اس وقت کون آسکتا ہے؟ انہوں نے پٹاری سے نکلے ہوئے کاغذ تیزی سے واپس اسی میں رکھے، اسے بند کیا اور طاق پر رکھ ہی رہے تھے کہ کنڈی کی آواز دوبارہ آئی۔ انہیں نوری کی آواز سنائی دی۔ وہ انہیں پکار رہی تھی۔

وہ اُسے تسلی دیتے ہوئے اوطاق سے نکلے، آنگن سے گزر کر اپنے شکستہ دروازے تک گئے اور زنجیر ہٹائی

سامنے وڈیرہ اللہ ڈنو کا کارندہ کھڑا تھا۔ سلام اور احوال طلبی کے بعد اُس نے بتایا کہ وڈیرہ سائیں کے کچھ مہمان آئے ہیں اور وڈیرہ سائیں نے انہیں بلایا ہے۔

"تم چلو۔ میں آتا ہوں"۔ انہوں نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور پلٹ گئے۔

"کون تھا بابا؟" نوری کی آواز میں امید کا لپکا تھا۔ گاؤں کے بعض بچے بابا کے پاس پڑھنے آتے تھے، کچھ نوجوان شاہ کے کلام کی تفسیر و شرح سمجھنے کے لئے آجاتے تھے۔ کبھی کبھی اُنہی میں سے کوئی کھیر کا پیالہ یا بریانی کی طشتری پہنچا جاتا تھا۔ آخر استاد کا حق بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔

"وڈیرہ سائیں نے بلوایا ہے۔ اُن کے مہمان آئے ہیں"۔ سائیں فیض بخش نے دھیمی آواز میں کہا اور نوری کی آواز تیل سے خالی چراغ کی طرح بھڑک کر بجھ گئی۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے اوطاق میں آئی، خاموشی سے پلنگ کے نیچے سے اُن کے جوتے نکالے، صندوق سے ان کی دھندلائے ہوئے رنگوں والی اجرک نکال کر اُن کے ہاتھ میں تھمائی اور باہر چلی گئی۔

سائیں فیض بخش نے اُس کی پیٹھ دیکھی تو سینے میں خنجر اُتر گیا۔ وہ بھی بھگت سنگھ اور جتن داس کی راہ چلتے تو آج یہ پیٹھ تو انہیں نہ دیکھنی پڑتی۔ جانے والوں کو بھلا گیا نظر آتا ہے۔ لیکن اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ تاریخ میں نام لکھوانے کا وقت گزر چکا تھا۔ انہوں نے گھسے ہوئے جوتے میں پیر ڈالے،

اجرک اوڑھی، چراغ اٹھاکر باہر آئے نوری ٹھنڈے چولہے کے قریب بے چراغ چھپر میں سر نیہوڑائے بیٹھی تھی۔

"یہ رکھ لے بیٹا" انھوں نے جلتا ہوا چراغ اس کی طرف بڑھایا۔

"نہیں بابا، اسے بجھا دو، ابھی چاند چڑھے گا تو سارے میں چانن ہو جائے گا" نوری نے ان کے ہاتھ سے چراغ لیا پھر اُس کی ایک پھونک نے چراغ کی لو کو کھا لیا۔

گھر میں اندھیرا بچھ گیا،

"کنڈی چڑھا لے"، ان کی لرزتی ہوئی آواز نے کہا اور پھر وہ سایہ سے گھر سے باہر نکل گئے۔

گلیوں سے گزرتے ہوئے، اکا دکا راہگیروں کے مودبانہ سلام لیتے ہوئے وہ وڈیرہ سائیں کی حویلی کے سامنے پہنچے۔ باہر کئی اونٹ بیٹھے جگالی کر رہے تھے اور ڈکرا رہے تھے۔ کارندوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ بڑے احترام سے اندر پہنچائے گئے۔ وڈیرہ سائیں کے اوطاق میں ہنڈے جل رہے تھے۔ انگریزی وضع کی کرسیوں پر کئی لوگ بیٹھے تھے، اندھیرے کی عادی اُن کی آنکھیں اتنی بہت سی روشنی سے چندھیا گئیں اور انہیں آنکھوں پر اپنے ہاتھ کی اوٹ کرنی پڑی۔

"آؤ سائیں آؤ۔ خیر سلامت"، یہ وڈیرہ سائیں کی کراری اور بھری پُری آواز تھی۔

"خیر سلامت سائیں" وہ قریب ترین خالی کرسی پر جلدی سے بیٹھ گئے۔ اب اُن کی آنکھیں آہستہ آہستہ روشنی کی عادی ہو رہی تھیں۔ انہوں نے عاجزی و انکساری سے مسکراتے ہوئے اُن لوگوں کی طرف دیکھا جو وڈیرہ سائیں کے مہمان تھے اور بڑے تکلف سے بیٹھے تھے۔ اُن کی سیاہ اچکنیں اور چوڑی دار پاجامے سفید براق شلواریں، سروں پر مور کے پروں ایسے کلف لگے ہوئے اور گردن کی جنبش کے ساتھ ساتھ تھرکتے ہوئے طرے۔ یہ سب تو بہت دور سے آئے تھے۔

سائیں فیض بخش سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بڑے شہروں کا شور اور ان کی چہل پہل کہیں بہت دُور سے انہیں آواز دینے لگی، برسوں پیچھے سے۔ انہیں ان لوگوں پر رشک آیا۔ ان کے گھروں کو جانے والی سڑکیں پکی تھیں۔ ان کی عورتوں کو پانی کے لیے میلوں نہیں چلنا پڑتا تھا، ان کے ہاں قدم قدم پر اسکول کالج اور ہسپتال تھے، انہیں روزگار کے کتنے بہت سے موقع نصیب تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہاں بجلی آگئی تھی اور ہر وقت یہ دھڑکا نہیں رہتا تھا کہ تیل ختم ہو گیا تو کتاب کیسے پڑھی جائے گی۔

"یہ لوگ ایک تجویز لے کر آئے ہیں سائیں" ڈیرہ سائیں نے اپنی انگلیوں میں پھنسی ہوئی انگوٹھیوں سے کھیلتے ہوئے کہا اور وہ اپنے خیالوں سے چونک گئے۔

"کیسی تجویز سائیں"؟

"ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارا گاؤں راستے سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ پکی سڑک نہیں ہے کھیتوں کے لئے پانی نہیں ہے۔ سرکاری شفاخانہ نہیں ہے۔ یہ لوگ بڑی دور سے آئے ہیں۔ کہتے ہیں ریل کی پٹڑی بچھائیں گے تو پھر یہ سب چیزیں یہاں بھی ہو جائیں گی۔ گاؤں کے لوگوں کو روزگار ملے گا۔ مل لگیں گے۔ شفاخانہ اور اسکول کھلے گا۔ بجلی آئے گی"

سائیں فیض بخش اسکول اور بجلی کے نام پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اُن کے خون کی دھند لائی ہوئی سرخی میں کہیں امید کا جگنو چمکنے لگا آنے والوں میں سبھی ایک ایک کر کے بولنے لگے۔ اپنی تجویز کے حق میں دلیلیں دینے لگے۔

"سائیں اب آپ ہی بتاؤ۔ آپ استاد ہو۔ ضلع بھر میں چرچا ہے آپ کے علم کا، مشورہ دو اپن کو"

"آپ خود سوچیں جناب، خبر ہے کہ انگریز جارہا ہے اور ہم مسلمانوں کو نئی مملکت ملنے والی ہے یہ پسماندہ علاقوں کو بڑھاوا دینے کا وقت ہے۔ آپ اپنے ہی علاقے کو لیں، تعداد میں مسلمان زیادہ ہیں لیکن زور ہندوؤں کا ہے یہاں سے ہندو کو اب جانا ہوگا۔ ہمارے مسلمان بھائیوں کو ان کا حق ملنا چاہیئے"، مہمانوں میں سے ایک کف در دہن ہو گئے۔

"وقت آگیا ہے کہ ہم مل جل کر اپنے مسلمان بھائیوں کی بہتری کے لئے صرف منصوبے ہی نہیں بنائیں، واقعی کچھ کر گزریں۔ اسی لئے اتنی دور سے چل کر ہم یہاں آئے ہیں"، دوسرے کی آواز بھی خاصی بلند تھی۔

انگریز وعدہ کر چکا ہے کہ مسلمانوں کی مملکت ان کے اکثریتی علاقوں میں بنے گی، تو ہم انتظار کیوں کریں، اپنا کام ابھی سے کیوں نہ شروع کر دیں۔ یہاں ریل کی لائین نہیں ہے جو کسی بھی علاقے کی ترقی کے لئے بنیادی شرط ہے۔ انگریز نے جب ہندوستان پر حکومت کا منصوبہ بنایا تھا تو سب سے پہلے تجارتی کوٹھیاں قائم کی تھیں پھر ریل کی پٹڑی بچھائی تھی۔ اس علاقے کا سروے بہت

پہلے ہو چکا ہے، پٹڑی خاصی قریب تک بچھ چکی ہے، تھوڑا ہی سا کام رہ گیا ہے۔ ریلوے میں کچھ اپنے مسلمان افسر ہیں جو چاہتے ہیں کہ آزادی ملنے تک پٹڑی بچھنے کا کام ہو جائے " ایک صاحب نے بُردباری سے تمام صورتحال واضح کی۔

" آپ خود سوچو کتنی سہولت ہو جائے گی۔ سرکاری ملازموں کو آنے کی، آپ کو غلہ منڈیوں اور کاروباری شہروں تک جانے کی۔ آڑھتی، دکاندار، بابو، کسان، مزدور سب ہی فائدے میں رہیں گے، سب کچھ اپنا ہوگا، انگریز اور ہندو دونوں سے چھٹکارا ہو جائے گا"

سائیں فیض بخش کے دل پر گھونسا لگا۔ انہیں ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کی میٹنگیں یاد آگئیں۔ ان میں شریک ہونے والے یاد آگئے، میلے کپڑے، بڑھی ہوئی داڑھیاں، گھسی ہوئی کولہاپوری چپلیں۔ اُن لڑکوں کا اِن بردبار اور شاندار بزرگوں سے بھلا کیا موازنہ کیا جاسکتا تھا لیکن انہوں نے اپنی گفتگوؤں میں انسانوں کو کبھی مذہب کے خانوں میں کبھی تقسیم نہیں کیا تھا۔ اُن میں سے بیشتر لڑکے ہندو تھے، سکھ تھے، لیکن سائیں فیض بخش نے ان کی زبان سے کبھی ایک مرتبہ بھی، ہندو بھائیوں کی بہتری یا سکھ بھائیوں کی بہتری، کا جملہ نہیں سنا تھا۔

سانس کا پرندہ سائیں فیض بخش کے سینے میں پھڑپھڑانے لگا" بہتری کی بات تو صحیح ہے صاحب پر مذہب میں کیا رکھا ہے۔ سب اُس اوپر والے کی لیلا ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان، کیا رام اور کیا رحیم، سب چراغوں میں ایک ہی تیل جلتا ہے" سائیں فیض بخش گلوگیر ہو گئے۔ اِن لوگوں کے کہنے کے مطابق آزادی ملنے والی تھی۔ ان کی نگاہوں میں جتن داس، سانیال، اجے گھوش، بھگت سنگھ، رام محمد سنگھ آزاد اور کامادیوی کے نام اور چہرے گھوم گئے۔ یہ آزادی جو ملنے والی تھی اس میں کتنا بہت سا ہندو، مسلمان اور سکھ خون شامل تھا۔

" ریل کی پٹڑی سے ہندوؤں کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا؟ " وڈیرہ سائیں کے بڑے بیٹے نے ذرا ہیکل ہو کر پوچھا، اس کے زیادہ تر دوست ہندو تھے۔

" نہیں میاں اُن کو کیا نقصان ہوتا، وہ بھی فائدے ہی میں رہیں گے، یہاں سے جانے میں انہیں آسانی رہے گی۔ ویسے ہم ریلوے کے دو افسر ساتھ لائے ہیں، وہ ساری اونچ نیچ سمجھتے ہیں " ایک مہمان نے دھیمے لہجے میں میزبان کے بیٹے کو تسلی دی اور اپنے دو ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہر چیز تیار ہے جناب، سروے مکمل ہے، نقشے بن چکے ہیں۔ انگریز افسر بھی راضی ہے، سرکاری روپیہ میری تحویل میں ہے، بس آپ لوگوں کی اجازت کی ضرورت ہے"، ریلوے کے ایک افسر نے کہا گفتگو کا لہجہ جوشیلا ہوتا گیا۔ سائیں فیض بخش کو وحشت ہونے لگی۔ انہوں نے اس سے بھی زیادہ جوشیلی باتیں سنی تھیں۔ بم بنانے کی، بم مارنے کی، ریل اڑانے کی لیکن اپنی صلح جو طبیعت کے باوجود ان منصوبوں سے انہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی جبکہ یہ لوگ تو ریل کی پٹری بچھانے کی باتیں کر رہے تھے شاید وہ بوڑھے ہونے لگے تھے اسی لیے انہیں نئے لوگوں اور نئے ماحول سے اختلاج ہونے لگتا تھا انہوں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ پھر کسی نے بجلی کے تار کھینچنے اور اسکول کھلنے کا ذکر کیا۔ سائیں فیض بخش کا ڈوبتا ہوا دل تھم گیا۔ جب اپنا اسکول ہوگا تو اس میں پڑھانے کا اُن سے زیادہ بھلا کس کا حق ہوگا۔ وہ تاریخ کے کتنے اچھے استاد ہیں۔ سندھی تو خیر ان کی مادری زبان ہے، فارسی اور اردو بھی جانتے ہیں وہ ان سے کہیں گے کہ سائیں آپ بیشک مجھے صرف ایک مضمون پڑھانے کی تنخواہ دینا لیکن میں سب کچھ پڑھاؤں گا۔ ایک ہی تنخواہ میں سب کچھ۔ پھر آٹے کا کنستر بھی بھرا رہے گا اور تیل کا پیپا بھی۔ لیکن پھر تیل کے پیپے کی تو ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بجلی ان کے گھر میں تو سب سے پہلے آئے گی وہ استاد ہیں، علم کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ ان کے گھر میں اندھیرا تو ممکن ہی نہیں رہے گا۔ دل کے طاق پر امید کے ننھے ننھے دیئے جل اٹھے۔

ملازم نے آکر وڈیرہ سائیں کے کان میں سرگوشی کی، اس نے سر ہلایا، پھر ایک طرف فرش پر دسترخوان بچھنے لگے۔ سائیں فیض بخش ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے "اچھا سائیں اجازت، اب چلتا ہوں"

"ابھی کہاں سائیں فیض بخش، بیٹھو بابا بیٹھو۔ ہمارے دسترخوان کو عزت بخشو" وڈیرہ سائیں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں سائیں، کھانا تو میں سرِ شام ہی کھا لیتا ہوں" سائیں فیض بخش کے مرجھائے ہوئے چہرے پر پھیکی سی ہنسی پھیل گئی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ارے بابا آپ بیٹھو تو سہی، آپ کی باتوں میں تو نشہ ہے سائیں نشہ آپ رہو گے تو سب کا جی لگا رہے گا"، وڈیرہ سائیں نے کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔ سائیں فیض بخش جانتے تھے کہ یہ درخواست نہیں حکم ہے، اُن کے کندھے ڈھلک گئے اور وہ بھی دوسرے مہمانوں

کے ساتھ فرش پر ڈھے گئے۔

اوطاق طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو سے بھر گیا۔ بریانی، پلہ مچھلی، کھانڈ کی کھیر، حریرہ گرم کھانوں سے اٹھتی ہوئی بھاپ۔ سائیں فیض بخش کی آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگی۔ وڈیرہ سائیں اور ان کے مہمانوں کے اصرار کے باوجود وہ سر جھکائے خالی پلیٹ پر گڑھے ہوئے پھولوں سے کھیلتے رہے۔ ایک بے چراغ گھر کی بھوک چینی کی پھولدار پلیٹ میں بھوک کا زہر گھولتی رہی، ان کی انگلیوں کو ڈستی رہی اور اس کا زہر کھانوں کی خوشبو کے ساتھ نتھنوں کے راستے ان کے معدے میں اترتا رہا۔

چند ہی ہفتوں بعد گاؤں بھانت بھانت کے لوگوں سے بھر گیا۔ طرح طرح کی بولیاں بولنے والے مزدور، فولاد کے ٹکڑوں اور سلیپروں سے بھرے ہوئے ٹرک، دن بھر سائیں فیض بخش کے گھر کے سامنے والے میدان میں دندناتے رہتے۔ سامان اترتا رہتا۔ مزدور شور مچاتے رہتے۔ ریل کی پٹری ان کے گھر سے بس چند ہی گز کے فاصلے سے گزرنے والی تھی۔ قریب ہی ریلوے کالونی بننے کا منصوبہ بھی تھا۔ ان دنوں سائیں فیض بخش کو کاپتور بہت یاد آتا تھا۔ ویسا ہی شور، ویسی ہی ٹھک ٹھک، کھٹ کھٹ، مزدوروں کے چائے پانی، سگریٹ بیڑی اور کھانے کے لیے کئی کھوکھے وجود میں آگئے تھے۔ سائیں فیض بخش ہفتے میں ایک دو بار گھر سے نکل کر اس سارے منظر کو دیکھتے آپ ہی آپ مسکراتے اور پھر اوطاق میں آکر کوئی کتاب کھول کر بیٹھ جاتے۔ ان کی بصارت خوبصورت اشعار اور سماعت ہتھوڑوں کی آوازوں، مزدوروں کے شوروغوغا اور اوورسیئروں کے احکامات سے بھر جاتی۔

جلد ہی وہ وقت بھی آہی گیا کہ کام ختم ہو گیا اور ریل کی پٹری بچھ گئی، ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن بن گیا۔ اس سے متصل چند کوارٹر تعمیر ہو گئے جنہیں ریلوے کالونی کا نام دیا گیا تھا۔ ایک بار پھر سائیں فیض بخش کی وڈیرہ اللہ ڈنو کی حویلی میں طلبی ہوئی۔ سائیں فیض بخش وہاں پہنچے تو مہمانوں کے ہجوم میں وڈیرہ سائیں میزبان بنا بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ آج ریلوے اسٹیشن کے نام کا افتتاح(؟) ہے۔

سائیں فیض بخش نے ان سب لوگوں کو دیکھا۔ اچانک وہ لوگ انہیں بہت پیارے لگے۔ کیسے بے غرض تھے یہ لوگ، اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر یہ بار بار اس ویرانے میں آتے تھے محض اس لیے کہ دوسروں کو سہولتیں مہیا کر سکیں، ان کا ناتا دنیا سے جوڑ سکیں، انہیں شفاخانے، اسکول، بجلی اور

پانی فراہم کر سکیں کیسے بے نفس لوگ تھے۔ ان کی آنکھیں کناروں سے چھلکنے لگیں۔

"اتحاد ریلوے اسٹیشن کیسا نام رہے گا؟" سائیں فیض بخش نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا اور وڈیرہ سائیں کو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ وڈیرہ سائیں نے زندگی میں ایک ہی تو سبق سیکھا تھا کہ با اثر لوگوں کی ہر واہ کے پیچھے اپنی واہ کا ایضاً بھی لگاتے جاؤ، اللہ نے چاہا تو زندگی خوب بھری پُری گزرے گی۔

اس روز سارے گاؤں میں میلے کا سماں تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ انگریز کا جانا اور ریل کا پہلی مرتبہ آنا، دونوں خوشیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ اسٹیشن کے ساتھ ہی گڑھے کھود کر چولہے بنائے گئے تھے۔ اُن پر چاندی کی طرح چمچماتی ہوئی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں، اُن کے نیچے لکڑیوں کے گٹھے سلگ رہے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو ٹھہرانے کے لئے شامیانے لگ چکے تھے شامیانے اور پلیٹ فارم کو کاغذ کی رنگین جھنڈیوں سے سجا دیا گیا تھا۔

سائیں فیض بخش نے اس روز نہا کر اپنا سب سے اچھا جوڑا پہنا، بیوی کے زمانے کی عطر کی شیشی نکالی جو ایک چوتھائی بھری ہوئی تھی۔ اس میں سے بہت احتیاط سے انگشت شہادت کی پور پر چند قطرے نکال کر سینے پر ملے، پیروں میں جوتے پہن کر گھر سے نکلے اور اسٹیشن کی طرف چلے۔ گھر سے نکلتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ نوری نے پلنگ گھسیٹ کر آنگن کی دیوار سے لگا دی ہے اور اس پر کھڑی ہو کر اس رونق کا نظارہ کر رہی ہے۔ اس نے بابا کی زبانی دھواں اڑاتی چھک چھک کرتی ریل کا ذکر بہت سنا تھا لیکن ریل کو کبھی دیکھا نہ تھا، اب اس کی زندگی میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا کہ وہ کہانیوں کی ریل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے سائیں فیض بخش کو قدرے حیرت ضرور تھی کہ وڈیرہ سائیں کا کارندہ اب تک انہیں بلانے کیوں نہیں آیا ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا، وہ راستے میں کہیں رہ گیا ہوگا اتنے بہت سے کام ہیں، کسی انتظام میں اُسے دیر ہو گئی ہوگی۔ ریلوے اسٹیشن کا نام انہوں نے رکھا تھا، وڈیرہ سائیں اور اس کے مہمان آج کی بہت عزت کرتے تھے کہتے تھے کہ ضلع بھر میں اُن ایسا عالم و فاضل کوئی نہیں، ظاہر ہے وہ لوگ اسٹیشن کے نام والی تختی کی نقاب کشائی بھی انہی سے کرائیں گے

وہ عطر سے مہکتے ہوئے اسٹیشن پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ نام کی تختی پر سبز ریشم کا نقاب ہوا سے اڑ رہا ہے اور نیچے سے نستعلیق میں لکھا ہوا نام جھلکیاں مار رہا ہے، ہر طرف کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ان لوگوں کے ہجوم کے درمیان وڈیرہ سائیں کی جھلک نظر آئی۔ وہ بھیڑ کے درمیان سے راہ بناتے ہوئے وڈیرہ سائیں تک جا پہنچے، وڈیرہ سائیں نے انہیں دیکھا۔ اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیا اور پھر اُس طرف متوجہ ہو گیا جس طرف سے ریل کی کوکتی ہوئی آواز ابھی آئی تھی، سب لوگ جھک جھک کر اشتیاق سے دن کی روشنی میں پارے کی طرح چمکتی ہوئی پٹڑی کو اور اس پر بھق بھق کرتی، دھواں اڑاتی، تیزی سے اپنی طرف اڑتی چلی آتی ریل کو دیکھ رہے تھے۔ پلیٹ فارم اس کی آمد سے لرزنے لگا پھر بریکوں کی آواز آئی اور وہ تھمتے تھمتے ترول پر آ پہنچی۔

ریل کے رکتے ہی وڈیرہ اللہ ڈنو فرسٹ کلاس کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ سائیں فیض بخش اس کے پیچھے تھے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے مور کے پروں ایسے طرول والے اور سیاہ اچکنوں والے اُترے۔ سائیں فیض بخش نے آگے بڑھ کر مہمانوں سے ہاتھ ملانا چاہا لیکن وڈیرہ سائیں کے کارندے آنے والوں کے گلوں میں گلاب کے ہار پہنانے میں مصروف تھے مہمانوں کی گل پوشی کرنے والے کارندوں کے ریلے نے انہیں قدرے پیچھے دھکیل دیا۔ انہوں نے وڈیرہ سائیں کو فرسٹ کلاس سے نکلنے والے ایک انگریز کی طرف لپکتے دیکھا لیکن پھر فوراً ہی انہیں اندازہ ہوا کہ باہر آنے والا انگریز نہیں۔ انگریزی لباس پہنے ہوئے ہے۔ وڈیرہ سائیں نے آگے بڑھ کر اس کے قدم لیے۔ اُسے اپنے ہاتھوں سے گلاب کا سب سے موٹا اور قدموں کو چھوتا ہوا ہار پہنایا، پھر سب لوگ اُس تختی کی طرف چلے جس کی نقاب کشائی ہونی تھی۔

سائیں فیض بخش نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ یہ نہ ہو کہ مہمانوں کے سامنے وڈیرہ سائیں کی سبکی ہو لوگ کیا کہیں گے کہ جسے نقاب کشائی کرنی ہے وہ اس قدر پیچھے ہے۔ لوگوں کو ہٹاتے ہوئے وہ جب تختی تک پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ انگریزی لباس والے شخص کی انگلیاں سبز ریشمی نقاب کی دوڑی کو کھینچ رہی ہیں۔ سائیں فیض بخش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ خطِ نستعلیق میں لکھا ہوا اور ان کا رکھا ہوا نام 'اتحاد' دھوپ میں پلکیں جھپکانے لگا اسٹیشن تالیوں سے گونج اٹھا تو ان کے ہاتھ بھی میکانکی انداز میں تالی بجانے لگے لیکن ایک سوئی سی ان کے سینے میں

ٹوٹ گئی۔ یہ نام تو میں نے رکھا تھا۔ یہ حق تو میرا تھا۔ پھر اُنہی کے اندر سے دوسری آواز آئی، لیکن نہیں اتحاد کا تو مطلب یہی ہے، یہ ہوتا ہے کہ سب کی محنت، سب کی مشقت، سب کی ہوتی ہے، انہوں نے اپنے آپ کو سمجھایا پھر بے اختیار گھوم کر گھر کی سمت دیکھا۔ لوزی کا چہرہ دیوار پر ٹنگا ہوا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں،

یہ پہلی ٹرین سے اُترنے والوں کا سامان پلیٹ فارم پر ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ چلنے کی جگہ بھی نہیں رہی تھی۔ ڈبوں کے دوسرے اور تیسرے درجے میں سفر کرنے والے سارے لوگ ریل سے اتر چکے تھے، کچھ دیر بعد دیگوں کے ڈھکن اتار دیئے گئے۔ گرما گرم سالن اور مصالحہ دار چاولوں کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ سائیں فیض بخش کی سوکھی ہوئی آنتوں تک یہ خوشبو پہنچی تو وہ تیز تیز قدم اٹھا کر پلیٹ فارم سے اتر کر اپنے گھر کی طرف چلتے چلے گئے

چند ہی ہفتوں میں زمین و آسمان بدل گئے، ملکانی گئے، للوانی گئے، مہتانی گئے، سندھو کی تہ میں سوئی ہوئی پرکھوں کی راکھ رہ گئی۔ اڈوانیوں کے بنوائے ہوئے پیاؤ رہ گئے، عالموں کے لگائے ہوئے پیڑ رہ گئے۔ انسان چلے گئے۔ اشیاء رہ گئیں۔ ریل چلتی رہی، پرانے جاتے رہے، نئے آتے رہے۔ خون کی بو سے بھیگی ہوئی اور زنا کی غلاظت سے لتھڑی ہوئی خبریں آتی رہیں۔

سائیں فیض بخش دیوانوں کی طرح گلیوں میں پھرتے رہے۔ اب تو سنچل کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ شاید وہ بھی چلا گیا، پر فقیروں کا، اُن کے بول بچن کا بھی کوئی دھرم ہوتا ہے! وہ تو سب کے ہوتے ہیں، آوازوں کا پرساد بانٹتے پھرتے ہیں۔ دل میرے مول دوست کا ڈیرا، سائیں کا ڈیرا بیچ بہے گنگا، بیچ بہے دجلہ۔ گنگا میں اب لاشیں بہتی تھیں اور زندہ رہنے والوں کی آنکھوں سے دجلہ۔

مہینوں وہ اسی طرح بولائے بولائے رہے۔ کبھی کسی کیکر کے نیچے بیٹھ کر ریل کی پٹڑی کو تکتے اور کبھی تیل کی کپی لے کر شام کو ویران مندر کی طرف نکل جاتے۔ ہو حق کرتے ہوئے مندر میں دھنوان اور دیالو مورتیاں انہیں تنہائی سے خوف کھاتی ہوئی اور اپنے پجاریوں کی دوسراہٹ کا دان مانگتی ہوئی نظر آتیں۔ وہ اداسی سے ان مورتیوں کو دیکھتے پھر ڈیوٹ پر رکھے ہوئے دیئے میں تیل کی کپی سے چند قطرے تیل کے ٹپکاتے، دیا روشن کرتے، تھوڑی دیر وہاں بیٹھے رہتے، کبھی ویرانی سے گھبراہٹ

ہوتی تو پُرسوز آواز میں شاہ کی کوئی وائی یا مولانا روم کے اشعار گنگنانے لگتے۔ آدمی دید ست باقی پوست است، دید آں باشد کہ دید دوست است، خشک تار و خشک چوب و خشک پوست، از کجا می آید ایں آواز دوست، خوشی رام، میرے سوہنڑے سائیں، میرے مٹھڑے سائیں، پھر سے تان اڑاؤ، سب ٹھاٹ پڑارہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ، خوشی رام کی آواز کا پرندہ ان کے وجود میں اپنے پر مارنے لگتا، اس کی آواز اپنے پنکھ کھولنے لگتی، اللہ اساڈا اسکا۔ میں آپیں کعبہ مکہ۔ بستیوں سے انسان کہاں چلے گئے تھے، ان میں حیوان کہاں سے آن بسے تھے؛

رات کا رنگ زہر کھائے ہوئے بدن کی طرح اُودا ہونے لگتا تو لٹے ہوئے قافلے کے میر کارواں کی مانند وہ گھر کو آتے۔

سال گزرا تو گاؤں کا حلیہ ہی بدل گیا۔ کھلے ہوئے میدانوں میں نئے نئے گھر تعمیر ہو رہے تھے۔ اُن دکانوں پر جہاں دن میں بھولے بھٹکے ہی کوئی خریدار آتا تھا، اب وہاں گاہکوں کی ریل پیل تھی۔ نئے آنے والوں نے نت نئے سامان کی سجی سجائی ہوئی دکانیں کھول لی تھیں۔ گلیوں میں لوگ زیادہ ہو گئے تھے اور چلنے کا رستہ تھڑ گیا۔ دائیں بائیں سے کانوں میں ہر وقت اجنبی بولیاں آنے لگی تھیں۔ سائیں فیض بخش کبھی کبھار کسی اشد ضرورت سے گھر سے نکلتے تو گاؤں انہیں اپنا گاؤں نہ لگتا، یوں محسوس ہوتا جیسے راستہ بھول کر وہ کہیں اور چلے گئے ہیں۔

شفا خانے کی عمارت تعمیر ہو چکی تھی اور اس کا افتتاح بھی ہو گیا تھا۔ ایک بار نوری وہاں سے ملیریا کا مکسچر اور سر درد کی گولیاں بھی لے کر آئی تھی۔

اسکول کی عمارت بن چکی تھی اور چند ہی مہینوں میں اسکول کھلنے والا تھا۔ ان کی ہمت تو نہیں پڑتی تھی لیکن نوری کے بار بار کہنے پر انہوں نے سوچا کہ انہیں اب وڈیرہ سائیں کے پاس جانا چاہیے اور اپنی خدمات پیش کرنی چاہئیں۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد ایک دن انہوں نے نہا کر بالوں میں تیل ڈالا، صاف جوڑا پہنا، داڑھی میں کنگھی کی، نوری سے مانگ کر آنکھوں میں سرمہ لگایا اور پھر وڈیرہ سائیں کی حویلی جا پہنچے۔ حویلی اب خاصی بدل گئی تھی، نئی وضع کا سامان آگیا تھا اور وڈیرہ سائیں کی شان میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اوطاق

میں پہنچ کر انہوں نے وڈیرہ سائیں سے بات شروع کی اور انہیں اطمینان دلانا چاہا کہ ایک ہی تنخواہ میں وہ تین چار استادوں کی جگہ سنبھال لیں گے تو وڈیرہ سائیں نے درمیان سے ہی ان کی بات کاٹ دی، انہیں یہ سن کر جھٹکا لگا کہ استادوں کی تعیناتی تو بہت پہلے ہو چکی ہے اور چند ہی دنوں میں ریل اُن استادوں کو لے کر آنے والی ہے۔

"لیکن سائیں اس کی کیا ضرورت تھی میں جو موجود ہوں، اب آپ دوسروں کو اتنی دور سے زحمت دو گے" سائیں فیض بخش کے لہجے کی لاچاری آنسوؤں سے گوندھی گئی تھی۔

"ہاں سائیں، وہ تو آپ صحیح کہتے ہو لیکن آپ اب آرام کرو۔ بوڑھے ہو گئے ہو آپ، یہ نئے لوگ ہیں۔ جوان ہیں سائیں۔ آپ تو یوں بھی ریٹائر ہو چکے ہو۔ اللہ اللہ کیا کرو،" وڈیرہ سائیں نے ریڈیو کے لٹو کو گھماتے ہوئے کہا۔ نئے وزیر اعظم کی تقریر آنے والی تھی۔

سائیں فیض بخش اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھے تو ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ انہوں نے نوری کے لیے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ ملازمت مل جائے گی تو اس کے لیے کچھ دان دہیز جمع کریں گے، ہاتھ پیلے کردیں گے اُس کے، اچھے کھانے اور ڈھنگ کے کپڑوں کو ترس گئی ہے وہ، دو چار جوڑے بنائیں گے۔ چوڑیاں خریدیں گے اس کے لیے، دو پٹی والی سنہری چپل انہوں نے ایک دکان پر دیکھی تھی۔ اس پر ۲ روپے ۱۵ آنے قیمت چھپی ہوئی تھی، سنہری ہی رنگ میں، وہ خریدیں گے اس کے لیے۔

اب وہ کس منہ سے اُس کے پاس جائیں۔ کیسے کہیں کہ ریل نئے استادوں کو نئے نوٹ کو کہیں اور سے لے کر آ رہی ہے۔

اُس روز جب شام ہوئی اور نوری چراغ لے کر آئی تو انہوں نے چراغ پھونک مار کر بجھا دیا۔ آج سر دُکھ رہا ہے بیٹیا۔ چراغ کو آج بجھا ہی رہنے دے، وہ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا، کی تفسیر بنے ہوئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ چراغ کی روشنی میں نوری آن کے چہرے پر لکھی ہوئی یہ تفسیر پڑھ لے۔

فولاد سے ڈھلی ہوئی پٹڑیوں نے جس ہزار داستان سفر کا آغاز کیا تھا۔ وہ طے ہوتا رہا۔

لوگ اتحاد ریلوے اسٹیشن پر اترتے رہے، گڑھوں میں دہکتے ہوئے چولہوں پر چڑھی ہوئی دیگوں کے کھانے کھاتے رہے اور کھلے ہوئے میدانوں میں چھاؤنیاں چھاتے رہے۔ اب لوگوں کے آنے پر کسی کا اختیار نہیں رہا تھا، وڈیرہ سائیں کا بھی نہیں۔ زندگی، ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی، لقویر بن گئی تھی۔

گاؤں پہلے قصبہ بنا پھر شہر میں بدل گیا۔ نئے آنے والے اپنے ساتھ بے شمار مسائل لائے تھے۔ اُن میں سے کچھ ہجرتیں پرانی ہوئیں اور کچھ ہجرتوں کا نیاپن وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ آنے والوں نے کھیت کھلیان خریدے، دکانیں مکان خریدے، پھر کچھ کرنل جنرل تھے جنہیں ان کی خدمت کے عوض صرف تنخواہیں نہیں دی گئیں، زمینیں بھی مفت دی گئیں۔ پھر وہ ہر طرف پھیلتے چلے گئے۔ پرانے لوگ گھٹتے گئے پیچھے ہٹتے گئے۔ انہیں ملازمتوں کے نہ ملنے کی اور سہولتوں کے نہ ہونے کی وہی پرانی شکائتیں رہیں۔ سائیں فیض بخش فضا میں پھیلے ہوئے تناؤ کو آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ شکائتیں تلخیوں میں بدل رہی ہیں، کدورتیں ابھر رہی ہیں پھپھولوں نے گھر دیکھ لیا ہے اور پھر انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ نفرتوں نے شاخِ دل پر آشیاں بنا لیا۔ ذہینیں آباد ہوگئیں اور دل برباد ہوگئے۔

آنے والوں اور آباد ہونے والوں میں یوں تو بہت سے تھے لیکن ایک مٹیلی شیروانی والے بھی تھے جن کا نام تو جانے کیا تھا لیکن وہ اپنے تخلص 'مہجور' سے پکارے اور پہچانے جاتے تھے۔ بڑے ڈاکخانے کے باہر لکڑی کا ایک خستہ حال قلمدان رکھ کر بیٹھتے تھے اور دوسرے شہروں کو ہر مہینے منی آرڈر بھجوانے والوں کے فارم بھرتے تھے یا اُن کے بولے ہوئے خط لکھتے تھے اور روزی کماتے تھے۔

آہستہ آہستہ جانے کس طرح سائیں فیض بخش اور مہجور صاحب میں شناسائی اور دوستداری کا ایک رشتہ استوار ہوگیا۔ دونوں زندگی کی تیز اور آگے بڑھتی ہوئی رَو سے کٹے ہوئے لوگ تھے۔ گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہتے اور ماضی کی راکھ کریدتے رہتے۔ مہجور صاحب مشاعرے

پڑھتے کئی مرتبہ کانپور گئے تھے، جب انہیں معلوم ہوا کہ سائیں فیض بخش کئی برس کانپور میں رہ چکے ہیں تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔ اب وہ دونوں اکثر کانپور کا تذکرہ کرتے۔ کئی بار سائیں فیض بخش نے کانپور کے حوالے سے کامریڈ دوستوں کا ذکر چھیڑنا چاہا تو رنجور صاحب ان مشاعروں کا قصہ لے بیٹھے جو انہوں نے لوٹے تھے۔ اُن مشاعروں میں پڑھی جانے والی طرحی غزلیں، اُن غزلوں کو لکھ کر دینے والے استادوں کی آپس کی چشمکیں اور اسی طرح کی داستانیں۔ چند کوششوں کے بعد سائیں فیض بخش کی پھر ہمت نہ پڑی کہ وہ بھگت سنگھ، جتن داس یا اجے گھوش کا ذکر کرتے، رنجور صاحب بہت اچھے انسان تھے۔ اسی لئے ان سے ایک تعلقِ خاطر تھا سو رہا۔

نوری کنواری ہی دہلیز پر بیٹھی رہی۔ وقت کا چرخہ اس کے بالوں میں کپاس کا تار کاتتا رہا پھر وہ ایک دن موت کی اندھی کالی حویلی میں رہنے کے لئے چلی گئی۔ سائیں فیض بخش کے لئے زمانہ ختم گیا۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ کس کے لئے جئیں۔ کھانا پینا سونا جاگنا، سب ان کے لئے بے معنیٰ ہو گیا تھا۔ شاہ جو رسالو، مثنوی مولانا روم اور گلستان و بوستان سعدی، میں اب اُن کا جی نہیں لگتا تھا۔ کبھی کوئی کتاب کھول لی، موتیا کی ماری ہوئی آنکھوں نے دھندلے دھندلے سے چند لفظ چن لئے اور بس۔ ذہن صحرا لئے تھر کی طرح پیاسا تھا اور اس پر اشعار کی تفہیم کے بادل اب بھولے بھٹکے ہی برستے تھے۔

اب جبکہ ان کا جانا صبح اور شام کی بات ٹھہر گئی تھی، انہیں کانپور والے انقلابی دوست بہت یاد آنے لگے تھے۔ شاید وہی صحیح کہتے تھے جب وہ کہتے تھے کہ کانگریس ہو یا مسلم لیگ دونوں انگریز سے اقتدار حاصل کر کے مطمئن ہو جائیں گے لیکن اس سے عوام کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ سماج کا قیام چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک کھیتوں میں بیج بکھیرتا ہوا کسان اور کارخانوں میں مشینوں کو حرکت دیتا ہوا مزدور بیدار نہیں ہوگا اور اقتدار کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے گا، تب تک انسانوں کی تقدیر نہیں بدلے گی۔

انسانوں کی تقدیر نہیں بدلی تھی، اُن کی اپنی تقدیر نہیں بدلی تھی۔ وہ اپنی تقدیر پر اب شاکر ہو چکے تھے اور تمام آرزوئیں ان کے وجود سے رخصت ہو چکی تھیں۔ وہ خواب جو

اُن کے دوستوں نے انہیں کاپنور میں دکھائے تھے وہ لمحوں کے پروں پر بیٹھ کر اتنی دور نکل گئے تھے کہ تصور کے جال میں بھی نہیں آتے تھے۔ ایک دوسرا خواب تھا جو وڈیرہ سائیں کے اوطاق میں آنے والے مہمانوں نے دکھایا تھا وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ریزہ ریزہ ہوا تھا۔ اب خواہشوں سے حقیقتوں کا وصال نہیں ہوتا تھا اور زمانے کے بطن میں خواب قرار نہیں پاتے تھے۔ آنکھوں میں کہیں سے روشنی کا مژدہ نہیں اترتا تھا اور دل تیتر کے پنجوں سے کُھدی ہوئی زمین ہو گیا تھا۔

اُنہی دنوں ایک سہ پہر اُن کے گھر کی کنڈی کھٹکی۔ انہیں حیرت ہوئی، اُن کے گھر کا دروازہ اب دن رات کُھلا رہتا تھا۔ گھر میں رہ کیا گیا تھا جسے محفوظ رکھنے کے لئے کنڈی لگائی جاتی۔ پھر کون تھا جو کھلے ہوئے شکستہ دروازے پر دستک دے رہا تھا؟

"کون ہے؟" انہوں نے برآمدے میں پڑی ہوئی جھلنگا چارپائی سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"آپ سے ملنے آیا ہوں" یہ کوئی اجنبی آواز تھی۔ نوجوان اور مؤدب۔

"آجاؤ۔ اندر آجاؤ"، انہوں نے جالا لگی آنکھوں سے آنے والے کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"میرا نام محمد جام بچل ہے" آنے والے نوجوان نے ان کے پیر چھوئے، مصافحہ کر کے ہاتھ سینے پر رکھا اور ادب سے پلنگ کی پائنتی پر ٹک گیا۔

انہوں نے اپنی بوڑھی ہڈیوں کو اور جگہ جگہ سے جھولتی ہوئی کھال کو سمیٹا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "مجھ فقیر کے پاس کیوں آئے ہو بیٹا؟"

"فارسی پڑھنے آیا ہوں آپ سے" نوجوان نے سادگی سے آنے کا مقصد بیان کیا۔

"اس زمانے میں فارسی پڑھ کر کیا کرو گے؟ ہمارے زمانے ہی میں فارسی پڑھنے والے سے کہا جاتا تھا کہ پڑھو فارسی، بیچو تیل پڑھنی ہے تو عربی پڑھو، سنا ہے عربی جاننے والوں کو ہزاروں روپے ملتے ہیں عرب میں" سائیں فیض بخش نے اداسی سے 'ہزاروں'

کا لفظ ادا کیا اور زندگی میں پہلی بار یہ حقیقت ان پر وحی کی طرح اُتری کہ اُنہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی پانچسو روپے بھی اکٹھے ہاتھ میں نہیں تھامے ہیں۔

"آپ درست کہتے ہیں سائیں۔ عربی اب قارون کے خزانے کی کنجی ہو گئی ہے لیکن مجھے تو فارسی پڑھنی ہے۔ اپنی شاگردی میں لے لیں آپ مجھے" اُس نے اُن کے پیروں کو تھام لیا۔

"نہ بیٹا نہ، مجھے گنہگار مت کرو" انہوں نے جلدی سے پیر کھینچ لیے "تم آجایا کرو میرے پاس، بس جلدی جلدی آؤ۔ چند ہی سانسیں رہ گئی ہیں سینے میں۔ جو کچھ میرے پاس ہے لے جاؤ پھر تو سب کچھ مٹی میں مل جائے گا۔" انہوں نے اپنی آنکھوں کے گوشوں میں جمع ہو جانے والے آنسو پوریں لیے اور پلنگ کی پٹی سے پونچھ دیئے۔

محمد جام دوسرے ہی دن سے اُن کے پاس آنے لگا۔ وہ اُن کی ہدایت کے مطابق آمدنامہ اور گلستاں، لے کر آیا تھا۔ یہ محمد جام عجب مست مولا تھا۔ عموماً وہ سہ پہر کو آتا۔ کبھی اُن کے لیے گڑ کی روٹی لاتا، کبھی حریرہ اور کبھی اُبلے ہوئے انڈے۔ اکثر جھاڑو لے کر اوطاق اور برآمدے کو صاف کر دیتا، کبھی صابن کی بٹی لے آتا اور ان کے میلے کپڑے دھو کر ڈال جاتا۔ اس کی بغل میں ہر وقت کتابیں اور رسالے دبے رہتے۔ کسی دن، گریک ٹریجدی اور رومن ہسٹری، پر کتابیں ہوتیں اور کسی دن مارکس اور اینگلز کے پشتارے،

اُسے دیکھ کر اور اس کی کتابیں دیکھ کر انہیں بے اختیار کانپور کے دن اور راتیں یاد آجاتیں۔ بیڑی پینے کا وہی انداز، کپڑوں کا وہی بے ڈھنگا پن، پیروں میں اسی طرح کی گھسی ہوئی چپلیں اور مزاج کی وہی درویشی۔ اُن دنوں سندھی میں کتابیں دھڑا دھڑ ترجمہ ہو رہی تھیں۔ ایک روز انہوں نے اُس کے پاس ناول، سدھارت دیکھا۔ یہ کسی جرمن کے ناول کا ترجمہ تھا۔ بہت عرصے بعد ان کا دل چاہا کہ اس ناول کو پڑھیں لیکن آنکھوں نے اب بڑی حد تک ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لفظ شاخوں پہ بیٹھے ہوئے پرندوں کی بجائے فضا میں اڑتے ہوئے بکھر جاتے تھے اور نگاہوں کی پکڑ میں نہیں آتے تھے۔

محمد جام نے چند ہی مہینوں میں گلستاں اور بوستاں دونوں ختم کر لیں۔ اب وہ اُسے ملا جامی

کی یوسف زلیخا پڑھا رہے تھے۔ اُسے پڑھانے میں انہیں لطف آنے لگا تھا اور عرصہ دراز کے بعد ان کے اندر زندگی کی رمق بیدار ہو گئی تھی۔

"اب تو بتا دو کہ اتنی محنت سے فارسی کیوں پڑھ رہے ہو؟" ایک روز وہ اچانک اس سے پوچھ بیٹھے۔

"سائیں آپ سے کیا چھپانا۔ ہمارے پاس ایران سے کچھ رسالے آتے ہیں، کتابچے آتے ہیں وہ سب فارسی میں ہوتے ہیں۔ اُن کا ترجمہ ہمیں درکار ہوتا ہے۔ باہر کے کسی آدمی سے ہم یہ کام کرا نہیں سکتے اسی لیے میری ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ فارسی پڑھوں۔"

سائیں فیض بخش کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ محمد جام کی نہیں سکھدیو یا ہنس راج کی آواز ہے۔ وہی جملے، وہی راز داری، ویسی ہی صورتحال۔

"تم کمیونسٹ ہو؟" اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

محمد جام اُن کا سوال سُن کر مسکرانے لگا۔ "اور کیا آپ کامریڈ نہیں ہیں؟" اُس نے جواباً ایک سوال داغ دیا اور وہ برسوں بعد بے اختیار ہنس دیئے، اُس روز کے بعد اُن دونوں کے درمیان اس موضوع پر پھر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ شاید اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ایک دن انہیں اس کی کتابوں میں ایک پنجابی کتاب نظر آئی۔ انہوں نے کتاب کی ورق گردانی کی۔ یہ شیخ ایاز کی نظموں کا پنجابی ترجمہ تھا جسے احمد سلیم نے کیا تھا۔ شیخ ایاز کا نام وہ برسوں سے سن رہے تھے۔ وہ کتاب اٹھا کر اپنی آنکھوں کے قریب لے گئے اور نظموں کے عنوانات پڑھنے لگے جو کہ جلی خط میں تھے۔ ورق الٹتے ہوئے ایک عنوان نے ان کی انگلیوں کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ نظم کا عنوان تھا، بھگت سنگھ دی پھانسی، اُن کے خون میں یادوں کی باڑھ آنے لگی۔ برسوں سے بندھے ہوئے بند ٹوٹنے لگے۔ کانپور کی گلیاں زندہ ہو گئیں ریلوے کالونی کے ایک کوارٹر میں بولتا ہوا، بحث کرتا ہوا، سیاہ گھنی کمان ایسی بھوؤں کے نیچے جادو جگاتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں والا نوجوان گنگنانے لگا۔ ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے۔ انہوں نے اشعار کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن لفظوں پر نمکین پانی کی چادر بچھ گئی اور ٹائپ کی باریک عبارت اُس چادر میں ڈوب گئی۔

"جام بیٹا اسے پڑھو، مجھے سناؤ"

محمد جام نے ان کی بھرائی ہوئی آواز سنی تو قدرے حیرت سے انہیں دیکھا پھر کتاب کے صفحے کو، یہ ایک گیت ناٹک تھا۔ بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، کشوری لال، سکھدیو، ڈاکٹر گیا پرساد اور راج گرو اس کے کردار تھے، مقام لاہور سنٹرل جیل کا پھانسی گھاٹ تھا۔

محمد جام کی آواز نے سکھدیو کا کہا دہرایا پھر وہ بھگت سنگھ کے مکالمے ادا کرنے لگا،

جھٹ پٹ جو پھانسی دا جھٹکا، بھن دیندا بندے دا منکا، مڑ لاش ہوا وچ جھلدی اے تے ایس دھرتی نوں تھلدی اسے، کچھ صدیاں لئی بھونچال جیویں، ایہہ اپنی موت سوال جیویں، ایک بھاری اور گمبھیر آواز اس شکستہ گھر کے در و دیوار میں گونجنے لگی اور سائیں فیض بخش جن کی آنکھوں سے نوری کی موت پر ایک آنسو نہیں گرا تھا، دھاڑیں مارنے لگے۔

گلوگیر آواز میں جام نے کہا تاریخ دے وچ اوہ دھڑک رہے، کچھ پل بجھ کے مڑ بھڑک رہے، جو اپنی اگ جلاندے نیں، دھوناں دے پھند گلاندے نیں۔ سائیں فیض بخش نے بے قرار ہو کر اپنی پیشانی پلنگ کی پٹی پر رکھ دی، جب سب آگ جلا رہے تھے، جب سب آگ میں جل رہے تھے تو میں کیوں اپنا دامن بچائے کھڑا تھا۔ خوشی رام مجھے گھسیٹ کیوں نہیں لیا تو نے۔ میرے سوہنے سائیں،

رات جب تمام دن کا اور زندگی بھر کے پچھتاووں کا زہر پی کر سیاہ پڑ گئی اور خنکی ان کی بوڑھی ہڈیوں میں گودا جمانے لگی، تب بھی ان کی نگاہوں کے سامنے پینسٹھ برس کی تاریخ مختلف جھانکیاں دکھاتی رہی۔ اُس رات انہیں بار بار اپنی پٹاری کا خیال آیا جس میں واپس نہ آنے والوں کی امانتیں تھیں۔ انہوں نے سوچا، کل محمد جام آئے گا تو یہ پٹاری میں اُس کے سپرد کر دوں گا۔ امانتیں اصلی وارثوں کے ہاتھ میں ہی پہنچنی چاہئیں۔

محمد جام نہ دوسرے دن آیا اور نہ تیسرے دن، چوتھے دن بھورصاحب اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ علاقے کے کئی لڑکے دہشت گردی کے الزام میں گرفتار ہو گئے ہیں

اور ان میں سے ایک محمد جام بھی ہے۔

سائیں فیض بخش کی سمجھ میں نہ آیا کہ جانے والے آنے کا وعدہ کر کے آتے کیوں نہیں۔ محمد جام کی ذات نے ماضی سے ان کا رشتہ عجب طرح جوڑ دیا تھا اور ان کے سینے میں مایوسیوں کی راکھ کے نیچے دبی ہوئی ایک چنگاری سلگا دی تھی، وہ اس کی رخصت کے ساتھ بجھنے کی بجائے بھڑک اٹھی۔ لوگ زلیخائے آزادی کی آرزو کرنے کی سزا میں کب تک کالی کوٹھڑیوں میں زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ یہ سوال ان کے ذہن میں پھن پھیلائے انہیں ڈستا رہا اور ان کے اوطاق کی زنگ آلود سلاخیں دار کھڑکی کے طاق میں رکھی ہوئی مثنوی یوسف و زلیخا کے ورق پھڑپھڑاتے رہے۔

چند دن انہوں نے خاموشی سے سوچتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے گزار دیئے پھر اچانک وہ گلیوں میں نکلنے لگے۔ ان کی جان پہچان کے لوگ خال خال ملتے تھے لیکن انہیں لوگوں کی اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو آس پاس کی فضا کو محسوس کرنے کے لئے نکلتے تھے۔ کبھی وہ ڈاکخانے چلے جاتے اور اس کی سیڑھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے میجو رصاحب کے پاس ٹک جاتے۔ کبھی وہ اس گھنٹہ گھر کے سامنے جا بیٹھتے جو آٹھ برس پہلے بنا تھا اور جس کے گھڑیال کی آواز دور دور تک سنی جاتی تھی۔

وہ گھنٹہ گھر کے سامنے بیٹھے ہوئے اپنی مندی مندی آنکھوں سے سیاہ سوئیوں کو رومن ہندسوں پر حرکت کرتے ہوئے دیکھتے رہتے وقت کی دیمک بڑے انہماک سے ہر چیز کو کھا رہی تھی لیکن کسی کو بھی کھائی ہوئی چیز کا ختم ہو جانا نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں سلیمان بادشاہ کی یاد آتی جو ہیکل بنواتے ہوئے مر گیا تھا اور جس کی ٹھوڑی عصا پر برسوں ٹکی رہی تھی، اس کی رعیت اس کے خوف سے ہیکل کی تعمیر میں مصروف رہی تھی۔ پھر دیمک نے جب اس کے عصا کے آخری ریزے کو بھی کھا لیا تھا تب سلیمان بادشاہ کی لاش منہ کے بل زمین پر آ رہی تھی اور لوگوں نے اپنے سر پر خاک ڈالی تھی کہ جس حکمران کی ہیبت و جبروت سے وہ اتنے دنوں دہشت کھاتے رہے ہیں وہ تو کب کا بیجان ہو چکا تھا۔

گھنٹہ گھر کی سوئیاں حرکت کر رہی تھیں، عصائے سلیمانی کو وقت کی دیمک چاٹ رہی

تھی اور فضا ایک نامعلوم تناؤ سے بھرتی جارہی تھی۔ اب وہ گھر سے نکلتے تو انہیں سڑکوں پر سے چھوٹے چھوٹے جلوس گزرتے ہوئے نظر آتے، انہیں گزرے ہوئے زمانے یاد آتے۔ کیسی مماثلت تھی ان میں اور آج کے دنوں میں۔ ان کے خیال میں یہ مماثلت محض ظاہری تھی۔ تاریخ خط مستقیم میں سفر نہیں کرتی، وہ وقت کے ہمالیہ پر کوہ پیماؤں کی طرح دائرے بناتی ہوئی اوپر کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے بعض لوگوں کو گمان گزرتا ہے کہ تاریخ دائروں میں سفر کرتے ہوئے اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے، سونگھ رہے تھے، سونگھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ بات کچھ اور آگے بڑھ گئی ہے۔ تاریخ کا گھومتا ہوا راستہ کچھ اور طے ہو گیا ہے۔

حبس بڑھتا گیا، اعتماد گھٹتا گیا۔ ان دنوں سائیں فیض بخش کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی، وہ کئی دن سے شہر میں نہیں نکلے تھے۔ ایک روز وہ اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے تو مہجور صاحب خبر لائے کہ عوام کو شرپسندوں اور تخریب کاروں کی کارروائیوں سے تحفظ دینے کے لئے ریل سے فوجی دستے پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے اسٹیشن کے ساتھ چھولداریاں لگا دی ہیں۔

سائیں فیض بخش نے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر دیکھا تو دور میدان میں انہیں چھولداریوں کی ایک بستی آباد نظر آئی اور ان کی آنکھوں میں برسوں پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب اسی میدان میں شامیانے لگے تھے، دیگیں کھلی تھیں، رنگین جھنڈیوں سے ماحول ست رنگا ہو گیا تھا اور آنے والوں کے استقبال کے لئے سارا علاقہ امنڈ آیا تھا۔ اُس روز میزبانوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ..... نہیں، انہوں نے تو بہت کچھ بھی سوچا تھا، اچھا ہی سوچا تھا،

کئی دن گزر گئے، سائیں فیض بخش کی طبیعت نہیں سنبھل رہی تھی۔ مہجور صاحب روزانہ ان کے پاس آتے، کبھی دلیہ، کبھی کھچڑی لے کر آتے، انہیں بیٹھ کر کھلاتے۔ ان کا دل بہلانے کے لئے باتیں کرتے لیکن ان دنوں سائیں فیض بخش کا دل باتوں سے نہیں بہلتا تھا۔

ایک دوپہر جب مہجور صاحب ساگودانے کا پیالہ لے کر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سائیں فیض بخش صاف ستھرا جوڑا پہنے بیٹھے ہیں اور ان کے کپڑوں سے خوشبو آرہی ہے۔

آج تو فیض بھائی تمہاری طبیعت بہت اچھی لگ رہی ہے" انہوں نے ٹوپی سر سے اتار کر پلنگ کے پائے کو پہنائی، چھڑی کو پلنگ پر لٹکاتے ہوئے کہا اور خود پائنتی بیٹھ گئے۔

"ہاں بابا۔ آج طبیعت بھلی چنگی ہے۔ دل چاہا آج نہا لوں، سو نہا لیا، کپڑے بدل لئے" سائیں فیض بخش مسکرائے

"بھیا آج تو عطر بھی لگایا ہے تم نے۔ بڑی لپٹیں آ رہی ہیں"

"آج پٹاری میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا تو تمہاری مرحومہ بھابھی کی نشانی اس کی عطر کی شیشی مل گئی۔ میں تو بھول گیا تھا اسے پٹاری کی تہہ میں رکھ کر۔ ایک ہی بوند رہ گئی تھی اس میں، بس وہی سینے پر مل لی ہے۔ پرانے زمانے کی چیز ہے، اس لئے ایک بوند کی اتنی خوشبو ہے آج کی چیزوں میں یہ بات کہاں" سائیں فیض بخش نے ایک آہ بھری۔

"ہاں فیض بھائی، درست کہتے ہو، پرانی باتیں تو گزرے ہوئے زمانوں کے ساتھ چلی گئیں" مجھو صاحب آبدیدہ ہو گئے۔

"آؤ سائیں۔ ذرا بازار گھوم آئیں" سائیں فیض بخش نے ساگودانے کا پیالہ ختم کرتے ہوئے کہا،

"اس ٹیلم ٹیک دوپہر میں کہاں جاؤ گے۔ ہفتوں سے تو پلنگ پر پڑے ہو۔ اب اس وقت بازار جانے کی کیا تک ہے۔ کچھ خریدنا ہے کیا؟" مجھو صاحب نے آنگن میں پھیلی ہوئی دھوپ کو دیکھ کر کہا۔

"کیوں مذاق کرتے ہو بابا، ہم بھلا کیا خریدیں گے۔ بس جی چاہ رہا ہے گھر سے نکلنے کا" سائیں فیض بخش کے لہجے میں اتنا اصرار تھا کہ مجھو صاحب نے پلنگ کے پائے سے ٹوپی اٹھا کر سر پہ جمائی اور چھڑی پر بوجھ ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

وہ دونوں باہر آئے ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ فضا الغرّوں سے گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ہی چولداریوں کی بستی بھی جاگ گئی۔ خاکی وردی والوں کی چال سے زمین دھمکنے لگی۔ ان کے دوڑتے ہوئے وجود بڑے بڑے ٹرکوں میں سمانے لگے۔

"سوا صدی پہلے دلی کو خاکی وردی والوں نے لوٹ لیا تھا۔ اب ویسی ہی پوشش والے یہاں کیوں آ پہنچے ہیں۔ اللہ اپنا رحم کرے" مجھو صاحب نے اس منظر کو دیکھا تو شیروانی

سے لوٹتے ہوئے بٹن سے الجھنے لگے۔ ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ان کا بھی ایک بیٹا کالج میں پڑھتا تھا، ہر وقت زندہ باد، مردہ باد کی باتیں کرتا تھا اور انہیں معاملات سے کٹ کر زندگی گزارنے کے طعنے دیتا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بہت سہمتے تھے۔

سائیں فیض بخش نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سر جھکائے چلتے رہے، ان کے پاس اب کسی سوال کا کوئی جواب نہیں رہا تھا۔ گزرتے ہوئے ان کی نظر اسٹیشن کے نام کی تختی پر پڑی۔ انہوں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ تختی بہت میلی ہو گئی ہے اور نستعلیق میں لکھے ہوئے نام کو کھرچ کر کسی نے خط نسخ میں اسٹیشن کا نام لکھا ہے

نعروں کی آواز اب بہت قریب آ گئی تھی۔ سامنے سے ایک بس نمودار ہوئی۔ بس پر موٹے موٹے حروف میں یونیورسٹی کا نام لکھا ہوا تھا۔ لڑکوں کے سر کھڑکیوں سے نکلے تھے، بعض آدھے دھڑ سے باہر لٹک رہے تھے کچھ چھت پر چڑھے بیٹھے تھے اور خاکی وردی والوں کو ٹھینگے دکھا رہے تھے، حلق پھاڑ پھاڑ کر ان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے ان کی بس ریلوے کراسنگ کی طرف بڑھی جس کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ بس ابھی وہاں تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ایک جیپ بس کو اوورٹیک کرتی ہوئی آگے نکلی۔ اس میں سے ایک افسر کود کر اترا اور بھاگتا ہوا پھاٹک تک پہنچا۔ اس نے پھاٹک والے کو پھاٹک بند کرنے کا حکم دیا اور پھاٹک آہستہ آہستہ بند ہو گیا۔

بس رک گئی، کچھ لڑکے نعرے لگاتے ہوئے بس سے نیچے اترنے لگے۔ سائیں فیض بخش کا دل پسلیوں کے پنجرے میں بے قراری سے پر مارنے لگا۔ وہ تیز تیز قدموں سے بس کی طرف بڑھے۔

"فیض بھائی کیا کرتے ہو۔ آگے مت جاؤ، رک جاؤ" مہجور صاحب نے لپک کر سائیں فیض بخش کی آستین تھام لی جسے انہوں نے ایک جھٹکے سے چھڑا لیا اور آگے بڑھتے گئے، مہجور صاحب گھبراتے ہوئے ان کے پیچھے تھے۔ سائیں فیض بخش نے اور مہجور صاحب نے نہیں دیکھا تھا کہ لڑکوں سے اترتے والے اپنے افسر کے حکم پر شست باندھ چکے ہیں۔ ان دونوں نے تو بس 'فائر' کی آواز سنی، جیسے جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کی آواز

لوگوں نے سنی ہوگی۔

فضا رائفلوں کی باڑھ سے گونج اٹھی۔ ٹین کے پتروں سے بنی ہوئی بس چھلنی ہو گئی اور اس میں بھرے ہوئے لڑکے خون اگلنے لگے جو لڑکے نیچے اتر چکے تھے وہ پلیٹ فارم کی طرف بھاگے تو گولیاں انہیں چن چن کر شکار کرنے لگیں۔

طیش، سائیں فیض بخش کے بدن میں آتش فشاں کے لاوے کی طرح پھوٹ پڑا وہ پلٹ کر پلیٹ فارم کی طرف دوڑے۔ ان کی سوکھی ہوئی اور کانپتی ہوئی ٹانگوں نے جانے کس طرح پلیٹ فارم کی اونچائی کو پھلانگا۔ یہ کیسا اندھیرا تھا۔ انہوں نے ناقابلِ یقین حیرت سے ان خاکی وردی والوں کو دیکھا۔ یہ کیسے لوگ تھے؟ ایک بھگت سنگھ بھی تو تھا۔ اُس نے سب کے لئے جان دی تھی اور یہ اپنوں ہی کی جان لینے کے لئے آ گئے تھے۔

ایک گولی ریلوے اسٹیشن کے نام کی تختی پر لگی اور 'اتحاد' کے 'الف' کو چھیلتی چلی گئی۔ ہانپتے ہوئے اور بھاگتے ہوئے سائیں فیض بخش نے رہ جانے والے 'تحاد' کو دیکھا اور اُن کے منطقی ذہن نے اُس لمحے بھی 'المنجد' کی اُس عبارت کو یاد کیا جس کے مطابق 'تحاد' کے معنیٰ ایک دوسرے سے ناراض ہونے اور باہم غضبناک ہونے کے ہیں۔

پھجو صاحب پلیٹ فارم سے نیچے کھڑے ہوئے انہیں آوازیں دے رہے تھے واپس بلا رہے تھے لیکن سائیں فیض بخش کے کانوں میں ایک بھولے بسرے گیت کی گونج تھی ہیلیکوپٹروں آوازوں کا لحن تھا، 'میرا رنگ دے بسنتی چولا'۔

انہیں اپنی گلی کا ایک نوجوان نظر آیا جو نشانے کی زد میں آ چکا تھا۔ وہ اُسے بچانے کے لئے بڑھے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ زمین پر گر چکا تھا اور اس کے سینے پر لالے کے پھول کھل رہے تھے۔ انہوں نے اُس کا ڈھلکتا ہوا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اُسی لمحے ایک دہکتا ہوا انگارہ ان کے بدن میں بجھ گیا۔ اُن کی گردن جھکتی چلی گئی۔ مُندتی ہوئی آنکھوں نے پلکوں کا کبھی نہ اٹھنے والا پردہ گرنے سے پہلے دیکھ لیا کہ آخری بوند کی خوشبو سے مہکتا ہوا ان کا چولا بسنتی ہو گیا ہے اور وہ اس ایمان کی سلامتی کے ساتھ رخصت ہوئے کہ دیمک عصائے سلیمانی کو کھا چکی ہے اور بادشاہ کا بے جان بدن زمین پر گرنے ہی والا ہے۔

مجرم

نورالھدیٰ شاہ

رات

سناٹا

آدمی کے اندر میں بھری ہوئی بُو، ہوا میں گھُٹی ہوئی اور ڈامر کی کالی سڑک پر بھاری بوٹوں کی چاپ،

کوکھ میں چُبھتی ہوئی اسٹین گن کی نالی سموت کی دھمکی۔

گدھوں کا فضا میں چکر

زندہ انسان جس پر انہیں نعش کا گماں ہو رہا تھا۔

جھٹکا، سسکی، آہ

چھلنی ہوئے جسم سے دھویں کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے نکلتی چیخ

پاتال سے پولار تک ایک شور

بند مقبرے کی دیواروں سے ٹکراتے ہوئے پرندے کے پر اور پرندے کی تڑپ جیسے اس شور کا

"ایکو ساؤنڈ ایفیکٹ" ہو۔

احتجاج پر پابندی لگی ہوئی۔

اخبار میں روزانہ رات کو جھوٹ سے منہ کالا کیے گھر گھر کے در در کے آگے، ہر صبح نعش کی طرح پڑی

ہوئیں۔ ریڈیو گلیوں کے آوازہ کتوں کی طرح مسلسل بھونکتا ہوا۔

ایئر کنڈیشن آفس میں بیٹھا سوٹیڈ بوٹیڈ (امپورٹیڈ) باس ! گوشت خور جانور کی طرح۔ خون کی بو پر نتھنے پھیلاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے۔

آدم بو۔ آدم بو

شکار۔ شکار۔

دروازہ کھلتا ہے، اسٹین گن کے دھکے سے گرتا ہوا، تقریباً باس کے قدموں کے پاس پڑا ہوا مجرم

مجرم کے پھولے ہوئے سانس کی آواز

باس کے دانتوں کے نیچے دبی دبی چیونگم کی خوشبو،

مجرم "بلیو می سر! میں وہ نہیں ہوں جو یہ سمجھ رہے ہیں۔ یہ سب کہتے ہیں کہ میں ہی وہ بھاگا ہوا قیدی ہوں کورٹ نے جسے سزائے موت سنائی تھی اور جو پھانسی پر چڑھنے سے ایک رات پہلے جیل سے بھاگ گیا۔ میں ... میں بھاگا ضرور ہوں سر! لیکن جیل سے نہیں، یہ ... یہ دیکھئے میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ یہ ... ہاں یہ دیکھئے میری پیٹھ پر چابک کے نشان اور یہ میری گردن پر گلا دبانے والی انگلیوں کے گھیرے دیکھ رہے ہیں نہ سر! ؟ میں ... میں اس نقطہ سے بھاگا ہوں جہاں پہنچ کر انسان برف کی سل کی طرح ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ جس طرح موت انسان کی رگوں میں اترتا ہے نا، بالکل اسی طرح۔

اعتبار کیجئے سر! میرے سامنے، میری آنکھوں کے سامنے وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو کسی بھی حساس آدمی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے کتنے جگ سر! کتنے جگ میں خود بھی کوئی بھی حرکت کرنے کی بجائے برف کی طرح ایک ہی جگہ پر پڑا رہا۔ لیکن یہ تو اسٹاپ گیپ تھا۔ اس کے بعد مجھے ایک ہی بات سوجھی تھی۔ سر! کہ میں برف کی اس سل پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دوں۔ نہیں تو کیا میں زندہ رہ سکتا تھا۔ ؟

مجھے یقین ہو گیا تھا سر! کہ میں مر چکا ہوں اور لوگ مجھے دفنانے کی بجائے سڑک کے کنارے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ تب مجھے اپنے آپ سے بھی گھن آنے لگی تھی، مردہ، گلے ہوئے نعش کی بو تو میں نے۔ آگ لگانے کے بعد مانا تھا سر! کہ ... میں زندہ ہوں۔

"میں ... زندہ ہوں سر!"

"بلیو می سر! میں ... زندہ ہوں۔ زندہ ... آ ... آ ... ہ ... ہ ... ہ"

پھولے ہوئے سانس کی آواز۔۔۔

سناٹا۔ اس کے زندہ ہونے کا احساس اس کے پاؤں میں پسینے کے قطرے بن گیا تھا۔ اور اس کے باس کی پیشانی پر بھی۔۔ چہرہ۔ یہ گھڑی بھر کے لئے ہلدی ملی ہوئی۔ مجرم محسوس کرتا ہے کہ وہ لوگ اسے سن نہیں رہے ہیں سمجھ نہیں رہے ہیں۔

یقین دلانے والی بھاؤناؤں سے وہ پھر بولنا شروع کرتا ہے باس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔

"مجرم۔ سر! پلیز! میری بات نہیں، یہ ۔۔۔ یہ مجھے اس وقت پکڑ کر لے آئیں ہیں، جس وقت میں شہر والوں کے بند دروازے کھٹکھٹا رہا تھا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ شہر والوں کو خوف کی بیماری لگ گئی ہے۔ وہ مسلسل ایک صدی سے خوف کی بیماری کے نتیجے میں بیہوشی کی نیند سوئے ہوئے ہیں اور سر! شہر والوں کے ہاتھوں اور پاؤں میں سوئے رہنے کی حالت میں زنجیریں پہنائی گئی ہیں۔ اور ۔۔۔ اور یہ سب کالے منہ والے لوگ جو مجھے پکڑ کر لے آئے ہیں، رات کو اسٹین گنیں لئے ان بند دروازوں کے نشانے لئے اندھیرے میں چھپ کے بیٹھتے ہیں۔ یقین کریں سر! مجرم تو یہ ہیں۔

اس بھاگے ہوئے قیدی کی آڑ لے کر۔ ان لوگوں نے، اس آدمی کو پھانسی پر لٹکا دیا ہے، اور جیل میں دفن کر دیا ہے جس نے اپنے اندر کی برف پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی ہے۔ یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ چاہتے ہیں سارا شہر بیہوشی کی نیند سوئے رہے اور یہ ان کے سوتے ہوئے ہی انکا خون چوس کر سانس کی ڈوری توڑ کر چلے جائیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے سر! ایسے تو سارا شہر قبرستان بن جائے گا، ایسا قبرستان جس میں کسی بھی قبر پر پہچان کا کوئی بھی قطبہ نہیں لگا ہوگا۔ جس پر کوئی بھی رونے والا باقی نہیں بچے گا۔ سر! شہر والوں کو کسی بھی طرح جگانا چاہیئے، قبرستان تو زندگی کا ابنت ہوتا ہے اور زندگی ۔۔۔ زندگی ابھی مری نہیں، لیکن ۔۔۔۔ مسلسل ایک صدی سے شہر والوں کے بند دروازوں پر کسی نوجوان ودھوا کی طرح منتظر کھڑی ہے۔ ذرا کان لگا کر سنیئے سر! زندگی کے رونے کی آواز کتنا ڈرانے والا اور دل دہلانے والا ہے۔ آپ سن رہے ہیں سر! آ ۔۔۔ پ ۔۔۔ سن ۔۔۔۔ رہے ۔۔۔۔"

پھولا ہوا سانس ایک پل کے لئے ٹوٹ جاتا ہے اور سناٹا، اسٹین گن پر ہاتھ اور مضبوطی سے جمے ہوئے۔ نشان کا نقطہ اس کے سینے کے اوپر ۔۔۔ لیا ہوا۔

اور سینے کے اندر دل طوفان میں پھنسی کسی ناؤ کی طرح۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ شاید وہ لوگ اسے

سن اور سمجھ نہیں رہے ہیں۔ نراشا کی شدید بھاؤناؤں میں گھرا ہوا، آشا کی آخری کوشش کے لئے اپنے آپ میں، طاقت جمع کرتا ہے۔

مجرم" ذرا میرے سینے پر ہاتھ تو رکھ کے دیکھیں سر! اندر میرا من ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ کیا آپ کا من بھی سر! آپ مجھے سن رہے ہیں نہ۔ اعتبار کریں سر! میں ہرگز وہ نہیں ہوں جو آپ اور یہ کالے منہ والے لوگ مجھے سمجھ رہے ہیں ۔۔۔ میں بھاگا ضرور ہوں لیکن جیل سے نہیں، میں پیچھا کرنے والی، اس قیامت سے بھاگا ہوں، جو ننگے پاؤں بنا آواز کئے، آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شہر والوں کو ختم کرنے کیلئے آرہی ہے۔ میں ۔۔۔ سر! اس قیامت کا راستہ روکنے کیلئے پہلے ہی بھاگا ہوں ۔۔۔ کہ جیسے ہی وہ سامنے آئے مجھ سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے، ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے لیکن ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ سر! انہوں نے مجھے رگ رگ سے کاٹا ہے۔ ان ۔۔۔ ان ۔۔۔ ردلو کتوں نے میرے پاؤں کے نیچے جلتے انگارے پھیلا دیئے ہیں۔ یہ میرا گوشت نوچ کر کھانا چاہتے ہیں ۔۔ یہ مردہ شہر کی سنسان سڑکوں پر بھونکنا چاہتے ہیں۔

اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ بھڑ ۔۔۔ ماں کے ۔۔۔ یہ کتوں کی ۔۔۔ اولاد ۔۔۔ یہ دھرتی کے نیچے ڈائنامیٹ بچھانے کی سازشیں کر رہے ہیں ۔۔۔ میں ۔۔۔ ان کو ۔۔۔ سر!

کنپٹی پر تھپڑ

گولی کی آواز

مجرم وہ جا گرتا ہے۔ بھاری بوٹوں کی چاپ تیز اور اسٹین گن کی نالی کا دباؤ اس کے سینے پر بڑھتا ہوا۔

سناٹا۔ بند کمرے کے اندر

مردہ پر؟ گدھوں کا ہجوم

آوازیں

امپورٹیڈ باس ٹیبل کے خانے میں سے دو کان نکال کر کنپٹی کے نیچے رکھتا ہے۔ ڈائل گھماتا ہے ون ٹو۔ مجرم کے بارے میں فیصلہ امپورٹ کرتا ہے

فیصلہ

موت۔ ٹو۔ تھری

اسٹین گن کا ہلکا جھٹکا اور گولی کی آواز۔

— مجرم کی تڑپ، آخری سسکی، آخری گھور،

اباؤٹ ٹرن۔

گدھیں مردہ شہر کی سنسان سڑکوں پر دوبارہ پھیل جاتی ہیں۔ ایک دوسرے شکار کی تلاش میں۔

باس کے امپورٹیڈ آرڈر کو اوبے کرنے کیلئے۔

گھٹن

بدرا بڑو

سورج، دور درختوں کے جھنڈ کے اس پار غروب ہو چکا تھا، بالکل اس طرح جیسے کسی دکھی من کی سلگتی جلتی لکڑی پر ناچتا ہوا آخری شعلہ بھڑک کر دامن چھڑا جائے۔ آکاش پر زرد اور سیاہی مائل سرخ روشنی، من کے اندر بجھتی لکڑی کی خاک کے نیچے تھکی تھکی جوت کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

مٹی اور تنکوں سے بنے پیرل کے چھوٹے سے مکان کے اندر لالٹین میں چھوٹا سا شعلہ بھڑک اٹھا اور اندھیرے سے لڑتے لگا ہر لمحہ بڑھتے ہوئے اندھیرے اور چھوٹے سے شعلے کی جنگ میں مکان کے اندر ہر شے کانپنے لگی۔ سائے روشنی سے بچنے کے لئے چیزوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پیرل کے دل کی قوت کو مایوسیاں، گدھوں کی طرح جھپٹ جھپٹ کر ایک طرف چھین رہی تھیں تو دوسری طرف جینے اور لڑنے کیلئے ابھار رہی تھیں۔

وہ کافی دیر سے ماں کے قریب بیٹھ کر اس کی پیشانی پر ابھری ہوئی بڑھاپے کی لکیروں کو پڑھ رہا تھا۔ یوں چولھے کے قریب ان کی عمریں اپنی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ ماں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد آہستہ آہستہ جلتی ہوئی لکڑیوں کو چولھے کے اندر سرکاتی جاتی اور گیلی لکڑیوں کے جسم سے پانی بھاپ بن کر آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ گیلی اور جلتی ہوئی لکڑیاں پیرل کو اپنی زندگی کی طرح محسوس ہوئیں۔ آہستہ آہستہ جلتی ہوئی اور اندر سے بھاپ نکلتی ہوئی۔

اس ماحول میں اندھیرے کا ساتھ دینے والی اگر کوئی چیز تھی تو وہ چولھے سے اٹھتا اور آنکھوں کو جلاتا ہوا دھواں تھا۔ دنیا چولھے کی مانند تھی اور گیلی لکڑیاں زندہ اور آہستہ آہستہ جلتی ہوئی زندگیاں تھیں۔

آج، میرل دیر سے آنے کا کہہ گیا تھا لیکن آج روانگی سے قبل اس کی ایک ایک حرکت معمول سے مختلف تھی۔ ویسے تو وہ کبھی نہیں بتاتا تھا کہ واپسی کب ہوگی۔ بس نیند سے اٹھ کر خاموشی سے تیاری کرتا۔ دو نوالے منہ میں ڈالتا اور روانہ ہو جاتا۔ لیکن آج خلافِ معمول وہ سویرے اٹھا تھا۔ تیاری میں دیر نہیں لگائی اور بغیر ناشتہ کئے روانہ ہو گیا۔ بس اتنا کہا "آج میں دیر سے آؤں گا!"

"کیا کہہ گیا تھا میرل! اور ٹائم کرے گا کیا؟" ماں نے دیگچی سے نگاہ ہٹا کر پیرل سے پوچھا۔

"کیا؟ - پتہ نہیں" اس نے خیالوں سے چونک کر کہا۔ وہ اپنے تفکرات میں ہی اتنا گم تھا کہ سوال نے چونکا دیا۔ "بتایا تو کچھ نہیں تھا اس نے!"

کچھ سمے گذر گیا۔ سوکھے نوالے حلق سے اتار کر پیرل ایک بار پھر اپنے خیالوں میں گُم ہو گیا۔ گرمی کا موسم اور مچھروں کے غول در غول۔ ڈنگ پہ ڈنگ، ایک طرف گرمی، دوجے مچھروں کے ڈنگوں کی جلن۔ طرہ یہ کہ سوچوں کی آگ۔۔۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

گندم کی بالیاں جھول رہی تھیں۔ اسے امید تھی کہ اس بار کچھ نہ کچھ بچ جائے گا لیکن تنگی نے اتنا تنگ کیا تھا کہ زندگی زہر ہو گئی تھی۔ ہر چیز خالی خالی، چکھنے سے دور، بس دیکھنے کے خاطر بچی تھی۔ کیا خرید اجائے کیا نہ خرید اجائے۔ بس غریب کا بھاگ۔

جب ماں کو سوکھے نوالے حلق سے اتارتے دیکھتا تو کانپ اٹھتا۔ کیا کرتا! کہاں جاتا۔ صبح سے سوچ رہا تھا کہ رئیس سے کچھ ادھار لے لے۔ لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ "دے گا تو ویسے بھی نہیں، الٹا سب کے سامنے بے عزت کر دے گا" پگڑی غریب کو بھی پیاری۔ اس کے سوا غریب کے پاس ہوتا ہی کیا ہے کہ جس کی خاطر جیئے۔ سوچ سوچ کر زہر کا گھونٹ پی جاتا۔ "دن پورے ہونے کو ہیں" یہ سوچ سوچ کر زہر کی کڑواہٹ مارتا رہا۔

"پیر محمد! - اے پیر محمد! پیرل!" باہر گلی سے یکے بعد دیگرے آواز پہ آواز آئی۔ دل دھڑک اٹھا۔ خیالات کا سلسلہ ریت کے گھروندے کی مانند ڈھے گیا۔ مڑ کر دیکھا، ماں جاگ رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ نہ پڑھ سکا۔ لیکن اس کی جسمانی حرکات بتا رہی تھیں کہ ایسی آوازوں کو وہ کوئی اچھا شگون نہیں سمجھتی۔

"بیٹے۔ دیکھو! خیر تو ہے ۔ ... اتنی رات گئے؟ ... میرے رب خیر کرنا۔"

" خیر ہے ماں! فکر نہ کر۔ میں ابھی آتا ہوں تم بیٹھو۔" جھوٹی تسلیاں۔

"پیرل! گھبراؤ نہیں۔ وہ۔ شہر میں میرل پکڑا گیا ہے۔ ساتھیوں کے ساتھ ہے۔" یہ میر شمد کا جگری دوست جانو تھا۔ ایک ہی مل میں کام کرتے تھے۔ پیرل نے اپنے آپ کو گہرے کنویں میں ہاتھ سے چھوٹے ڈول کی طرح گرتا محسوس کیا۔ لیکن خود کو سنبھال لیا۔

"کیوں! کیا کیا تھا؟" اس کی آواز گہرے کنویں سے نکلتی چلی آئی۔

"سائیٹ میں جلوس نکالا تھا، انھوں نے۔ چار مزدور گرفتار ہوئے ہیں۔ اس نے کہلا بھیجا ہے کہ فکر نہ کرنا۔ صبح کو ساتھ چلیں گے۔" یہ کہہ کر، جانو چلا گیا اور پیرل کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی گدھ نے آسمان سے اچانک غوطہ مارا ہو اور اس کے بے بس جسم کو چیر کر ایک ہی وار میں دل نکال لے گیا ہو۔ یا جیسے کسی نے دن دھاڑے اسے لوٹ لیا ہو۔

" لیکن یہ جانو کا بچہ اس قدر پرسکون تھا!" یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔ اسے یاد آیا کہ کچھ عرصہ قبل جانو بھی پکڑا گیا تھا۔ لیکن پھر اسے رہائی مل گئی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ میرل کو بھی چھوڑ دیں خدا کرے چھوڑ دیں، وہ سوچتا گیا اور اسے میرل پر بجائے رحم کے غصہ آتا گیا۔ لوفر کہیں کا۔ کیا ضرورت تھی ہڑتال کی۔ خود بھی مصیبت میں پڑا اور ہمارے لئے بھی جنجال۔ سیاست کرتا ہے بدمعاش اب ماں کو کون سمجھائے گا؟ اسے کیا بتاؤں۔ مر جائے گی!"

مگر ماں کو کچھ نہیں ہوا۔ نہ روئی، نہ بین کیا، نہ بے ہوش ہوئی۔ وہ کسی پہاڑ کی طرح کھڑی رہی یوں ردعمل دیا جیسے کوئی خاص بات تھی ہی نہیں۔ شاید زمانے کی سختیاں برداشت کرتے کرتے خود بھی سخت ہوگئی تھی۔ یہ کوئی پہلا موقعہ نہیں تھا کہ کوئی قریبی عزیز پکڑا گیا ہو۔ محنت کش کیلئے گرفتاری کچھ یوں ہے جیسے جلتی دھوپ میں کام کے بعد بیل کیلئے رسہ روز کا معمول ہے۔

لیکن ماں کا دل! اسے رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے بیٹے کو نیند سے جگایا۔ "پہلے رئیس کے پاس جانا!"

دل تو نہیں مان رہا تھا کہ رئیس سے کہے۔ مگر کسے کہے پہلے جانو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جانو ساتھ چلنے کیلئے تیار تھا مگر رئیس کے پاس نہیں۔ الٹا کہنے لگا "یوں میرل ہی نکلنے کیلئے تیار نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟" یہ بات پیرل کی سمجھ میں نہیں آئی۔"کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے پھر پوچھا۔

"جب تک یونین نہیں کہے گی وہ نہیں نکلیں گے!"جانو رک گیا۔"بھاگ دوڑ نہ کرنے میں ہی بھلائی ہے۔ اس طرح نکلا تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا" جانو نے سمجھایا۔

پیرل کو نہ بات کی ابتدا سمجھ میں آئی نہ انتہا۔"کیوں نہیں نکلے گا؟۔" یہ یونین کون ہے جس کے کہنے میں وہ آگیا ہے؟ بھلا نکلنے میں کیا برائی ہے۔" اسے کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آیا۔

"اچھا تم ٹھہرو میں آتا ہوں" پیرل نے اپنا فیصلہ کیا۔ جانو کو راستے میں چھوڑ کر سیدھا گیا رئیس اسماعیل خاں کے در پہ۔ آخر چھڑانے کی کوشش کیوں نہ کرتا؟ پہلی بات کہ بھائی تھا۔ دوسرے لوگ کیا کہتے؟ چھوٹا بھائی جیل گیا تو بڑے نے تھوکا بھی نہیں۔ اور ماں! اسے کیا کہتا۔ بھائی پر وقت آن پڑا تھا۔ منہ تو دینا ہی تھا رئیس آنا گیا گذرا بھی نہیں تھا کہ اس معاملے میں مدد نہ کرتا اور کچھ نہیں تو 'ہاں' اور 'حاضر' کی کمی تو نہیں۔

گلو، ۸۲ ماڈل کی نئی ٹویوٹا کیمرولا کو رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔ تجلی سے آنکھیں چندھیا جاتیں سویرے کا سورج تھا اگرچہ رئیس ابھی تک حویلی میں تھا لیکن کمّی پہلے ہی اوطاق میں جمع ہو چکے تھے دہی پرانا چکر، ہر روز کی طرح۔ کسی کے ڈھور (جانور) چوری ہوئے۔ کسی کا جھگڑا۔ کوئی راضی نامہ۔ کسی کی سفارش، پیرل بھی سب کے درمیان اپنا رونا لئے سرخ کار کو چمکتا دیکھ رہا تھا ہر ایک اپنے اپنے درد سے دوہرا۔ ایک دوسرے کو تسلیاں "اللہ بہتر کرے گا۔" "بس بھائی غریب کی حیاتی۔" باقی بے چین خاموشی۔

جمن، رئیس کے تین سالہ بھتیجے کو گود میں کھلا رہا تھا۔ بچہ اس کی بڑی بڑی مونچھیں پکڑنے کے لئے بار بار ہاتھ بڑھاتا۔ گلو ہنس پڑا۔ کمیوں کے چہروں پر مسکراہٹ ابھری۔ مگر پیرل سے مسکرایا بھی نہ گیا۔

اچانک خاموشی چھا گئی۔ رئیس اسماعیل خان آہستہ آہستہ حویلی سے نکل کر اوطاق کی طرف آرہا تھا۔ کوئی جلدی سے آگے بڑھا، کوئی آہستہ۔ جو پہلے پہنچا اس نے پہلے قدم چھوئے۔ جو بعد میں پہنچا اس نے بعد میں۔ پیرل بھی آگے بڑھا۔ جھکنا برا لگا پر کیا کرتا؟ زمانے کا رواج! وہ جھکا پیر چھوئے، سب کی طرح ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر اندھیرا اور زلزلہ۔

"خیر تو ہے نا پیرل؟" یہ رئیس کا فقط مخاطب ہونا نہیں تھا۔ بس جیسے کسی سوالی کی مراد پوری ہو

گئی ہو۔ پیرل کے چہرے پر ایک لمحے کیلئے رونق آگئی۔

"نہ ٹیں! خیر ہی تو نہیں!"

"بھائی کے لئے اُٹے ہونا" اسماعیل خان کو شاید پہلے ہی خبر ہو گئی تھی۔

"تم مائی باپ ہو رئیس! چھڑا کر دو" پیرل نے گویا اپنی بوسیدہ پگڑی رئیس کے قدموں میں رکھ دی۔

"ہاں۔ چلتے ہیں۔ لیکن پکڑا کس نے ہے؟" اسماعیل خان بھی شاید شہر کی طرف جا رہا تھا۔

"رئیس پتہ نہیں، جانو کہتا ہے مِل کی ہڑتال میں پکڑا ہے اسے"، پیرل نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اچھا دیکھتے ہیں! یہ تو پتہ ہے نا کہ کیس کہاں داخل ہے؟"

"ملٹری میں کہتے ہیں سائیں!" پیرل نے بچارگی سے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ ملٹری سے فقط رئیس اسماعیل خان ہی نمٹ سکتا ہے۔ اندھا کیا جانے کہ الاؤ کے آگے ایک چھوٹے سے شعلے کی کیا حقیقت ہے۔

"بڑی مشکل بات کہہ دی تم نے پیرل! ظالموں سے ہاتھ پڑ گئے ہیں"۔ رئیس خود بجھ سا گیا۔ اس نے سوچا تھا پولیس کا کیس ہوگا احسان جتانے میں دیر نہیں لگے گی۔ پوری عمر احسان جتاتا۔ لیکن اس بار تو کام ہی الٹا ہو گیا تھا۔ بے بسی کا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی پگ ڈھیلی ہو کر گرنے والی ہو۔

کوئی کتنا ہی نادان کیوں نہ ہو اپنا نقصان محسوس کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ پیرل کو احساس ہو گیا کہ رئیس ٹال رہا ہے۔ کیوں؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی "رئیس جو کہو گے وہ کروں گا" پیرل نے منت کرتے ہوئے گویا اپنے آپ کو رئیس کے ہاتھ بیچ دیا۔ اسماعیل خان کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس کا اپنا بھید بھی کسی سے چھپا نہیں تھا۔ اس بات سے کون لاعلم تھا کہ اس کا اپنا بیٹا بھی سیاسی دفعہ میں قید ہے! رئیس نے بہتر یہی سمجھا کہ اپنی مجبوری کا اظہار کر کے جان چھڑا لے۔

"یہ ملٹری والے کسی کی سنتے ہی نہیں بابا! ۔ میرا اپنا لڑکا بھی لے گئے ہیں۔ اب تو ہوم سیکریٹری بھی ہاتھ نہیں ڈالتا"، رئیس اسماعیل خان نے بھی اپنے ہاتھ نکال لیے۔ پیرل کو چپ لگ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ رئیس خود بے بس ہے، ورنہ رئیس کا بیٹا اور وہ بھی جیل میں!! آج ناممکن بات ممکن ہو گئی تھی نہ جانے کیوں پیرل نے سکون محسوس کیا۔ شاید یہ احساس کہ وہ جگ میں تنہا نہیں۔ ایسا ظلم فقط اس کے ساتھ

ہی تو نہیں ہوا تھا بلکہ رئیس اسماعیل خان بھی تو بھگت رہا تھا۔

جانو اور پیرل بس میں سوار ہو کر شہر پہنچے۔ رئیس اسماعیل خان کی بس میں چڑھے تھے۔ دیر لگی ہو گی کرایہ تو بچا۔ رئیس کے لوگ اس کی بسوں میں کرایہ سے مستثنیٰ تھے۔

جیل پر ملاقات کیلئے میرل کا نام لکھوایا۔ کچھ لمحے کھڑے رہے۔ جیل کا کالا آہنی دروازہ دیکھ کر پیرل کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ "پتہ نہیں کن حالات میں ہو گا میرا بھائی! شاید مارتے بھی ہوں گے۔" آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ دل مضبوط کئے آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو پیتا چلا گیا۔ جالیوں کے اُس طرف سلاخوں کے پیچھے سے میرل کا چہرہ دیکھ کر بند ٹوٹ جاتے لیکن میرل کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اداسی مر گئی۔ بڑا ہونے کے ناطے ذمہ داری کے احساس نے اسے مضبوط کر دیا۔ گویا آدمی ہی بدل گیا ہو۔ کہنے لگا "گھبرانا مت! ۔ ڈٹے رہنا۔ نام نہ ٹلوا دینا۔ یہ ملٹری والے اب زیادہ نہیں رہیں گے گھر میں سب خیریت ہے۔ سب خوش ہیں۔"

واپسی میں پیرل اپنا جائزہ لینے کے بعد خود حیران تھا۔ اس نے جو گفتگو کی تھی اس پر تو دادا سے تعجب تھا۔ جانو اس تبدیلی پر مسکرا رہا تھا۔ پیرل اپنی سابقہ پریشانی اور رویہ پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ یہ سب کیوں ہوا! کیسے ہوا! ۔ پیرل کو کچھ بھی تو سمجھ میں نہ آیا۔

شام کو ماں کے قدموں میں بیٹھ کر وہ کہہ رہا تھا۔ "بڑا بہادر ہے تیرا بیٹا۔ شیر ہے شیر بات بات پہ قہقہہ مارتا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ جیل میں ہے۔ رئیس کا بیٹا بھی مل گیا ہے اُسے۔ تم سے دعا مانگتا تھا۔"

ماں نے دعا تو بہت دی لیکن یہ نہ سمجھ سکی کہ میرل نے ملٹری والوں کا کیا بگاڑا ہے۔ پیرل نے بھی سمجھانے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن اچھی طرح وہ خود بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ بس اتنی بات سمجھ پایا تھا کہ "ہاری مزدور اور سیاسی لوگ کہتے ہیں کہ ووٹ ہوں اور ملٹری چلی جائے کہاں جائے اور اس سے کیا حاصل ہو گا یہ اب تک غیر واضح تھا۔ جانو نے بتایا تھا کہ "جمہوریت ہو گی۔ وزیر ہوں گے۔ بجلی آئے گی۔ سڑک آئے گی۔ داد ہو گا۔" اور کیا کیا ہو گا وہ بھول گیا تھا۔ کام تو سب اچھے لگے لیکن چکر سمجھ میں نہیں آیا۔

آج گھر میں کافی لوگ آئے تھے۔ ہر ایک پوچھنے آ رہا تھا۔ ماں پہلے ہی پریشان، مزید پریشان

ہو گئی۔ کس کس کو سمجھائے اور کیا سمجھائے "خدا جانے بہن پیرل بتا رہا تھا کہ لوگ ملٹری والوں کو کہتے کہ ووٹ کراؤ۔ اسی لئے وہ لوگوں کو پکڑ رہے ہیں۔ بہت سارے پکڑے ہیں" "ہاں بہن تیرا بھائی بھی کہتا تھا" ملک میں بدامنی ہو گئی ہے۔ یہ مرا امریکہ نہ جانے کون ہے۔ زمانہ ہی عذاب بن پڑ گیا ہے۔ آدمی، آدمی کی بوٹیاں چبا رہا ہے۔ یہ قیامت کی نشانی ہے بہن قیامت کی" ماں سر باندھ کر لیٹ گئی آدھے سر کے درد نے ادھ مُوا کر دیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے درد کبھی نہیں جائے گا اور یہ عورتیں! خدا کی پناہ! جیسے انہیں کوئی اور کام ہی نہیں ماسوا مزید پریشان کرنے کے۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ سب نیا تھا۔ سب بدلی بدلی باتیں۔ ادھوری۔۔ ادھوری۔ شہر میں نئے نئے خیالات کی الٹ پلٹ کی گونج۔ غیر واضح اور ادھوری ادھوری۔

وہ شام پیرل کیلئے بھی عذاب تھی۔ چچا مہر علی نے جرح کر کر کے اسے پھر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا "بیٹا یہ تو صحیح ہے کہ سب اچھا ہوگا لیکن تیرے بھائی کو کیا ملے گا؟ آج کل کے لڑکوں کا تو دماغ چل گیا ہے۔ ارے کچھ تو بڑھیا کا بھی خیال کرو۔ اس عمر میں بھی اسے دکھ دو گے کیا؟ بیٹے پہلے گھر پھر جگ۔ جگ تیرے بھائی کے سر نہیں پڑی۔" پیرل کا ذہن قلابازیاں کھا کھا کر تھک گیا۔ سیدھا سادہ ذہن ہر بات سچی لگ رہی تھی۔ "چچا مہر علی بھی ٹھیک کہتے ہیں! غلط میں بھی نہیں۔ جانو تو ہوا جٹ پر اسماعیل خان کا لڑکا تو کالج میں پڑھتا ہے۔ ماں کا دکھ بھی دیکھا نہ جائے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سرکار کو گالیاں دینے لگا گالیاں دے کر پیٹ بھرا تو خاریں سر باندھ کر سو گیا کھانا بھی نہ کھایا۔

پیرل کو تین مہینے سزا ملی۔ دس کوڑے لگے۔ رہا ہو کر آیا تو لوگوں نے پھول پہنائے ماں گھر سے نکلنے نہ دے۔ کہتی "تیرا جانو سے ملنا بند ہے" خدا خدا کر کے اجازت ملی۔ ماں کا دل بھرا تو پھر نوکری پہ جا چڑھا۔ محنت کش تو اس طبقہ سے ہے جو ہاتھ چلائے تو سب کو کھلائے۔ مالک کو کما کر دے تو چند ٹکڑے عیال کو بھی نصیب ہوں باقی بچا کھچا اپنے پیٹ میں ڈالے آخر کتنے دن کیلئے بھائی کی کمائی پر گھر چلتا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ملک میں دہشت پھیل گئی۔ پہلے جہاز اغوا ہوا، پھر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈر گرفتار ہوئے۔ شہروں سے کئی نوجوان پکڑے گئے۔ گاؤں سے

رئیس کے لڑکے کو بھی پکڑا پھر چھوڑ دیا۔ پیرل چپ چاپ دیکھتا رہا چاروں طرف خوف و ہراس پھیلتا جا رہا تھا۔ لوگوں کو اپنے سائے سے بھی خوف آنے لگا یوں لگتا تھا جیسے سی آئی ڈی جنات کی طرح پھیل گئی ہے۔ پیرل نے اپنے اندر میں خوف کے ساتھ غصہ بھی محسوس کیا۔ ایسا غصہ جو ایسے ڈکیت کے خلاف پیدا ہوتا ہے جس کی اچانک کوئی چٹھی پہنچتی ہو کہ، ... "ورنہ... زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" پھر چاہے وہ آئیں یا نہ آئیں۔ فی الحال تو نیند حرام ہو گئی ہر جگہ ایسی خاموشی تھی۔ جس میں خاموشی ہی نہیں تھی۔ اب وہ بہت ساری باتیں سمجھنے لگا تھا۔ جن گتھیوں کو وہ پہلے سلجھا نہ سکا تھا انہیں اب وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن خود بخود حل کر دیتا۔ لوگ جو کچھ کتابوں میں پڑھتے تھے۔ وہ وقت اور لوگوں کے چہروں سے پڑھ لیتا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جس میں پتہ بھی نہیں ہلتا پھر دو سال تک پتہ بھی نہیں ہلا۔ گھٹن بڑھتی چلی گئی۔ چاروں طرف غصہ ہی غصہ۔ خاموشی میں کتنی تبدیلیاں ہوتی ہیں یہ پیرل کیلئے نئی بات تھی۔ اسے یوں لگا جیسے گاؤں میں نہ کوئی بچہ ہے نہ بوڑھا۔ نہ عورت نہ مرد۔ بس کچھ تھا۔ کیا تھا!! کوئی عجیب احساس، کوئی تاؤ... نہ اس احساس کے کوئی معنی نکلتے تھے اور نہ ہی اس تاؤ کی کوئی واضح شکل تھی۔ نہیں کچھ یوں تھا جیسے برادے میں لپٹی ہوئی برف کو دھوپ میں رکھ دیا جائے اور وہ تپش میں پگھلتی چلی جائے۔

بالیاں، تیز دھوپ میں پکتی ہیں اور ذہن دکھ کے تندور میں۔ تندور تپنے لگا تھا۔ تاؤ اندر تک پہنچا تو اس نے سیاسی رخ اختیار کیا۔ لوگوں کی آنکھیں بدل گئیں۔ کچھ ہونے والا تھا۔ ہر جگہ سرگوشیاں تھیں۔ سب کی قوتِ سماعت بڑھ گئی اور نگاہیں عقاب ہو گئیں تھیں۔ حاجی کا ہوٹل اب دیر تک چلنے لگا تھا۔ ماں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ پیرل کی بڑھتی ہوئی آوارگی سے تنگ آ گئی تھی۔ دوسرا راستہ نہ ملا تو پیرل سے شکایت کر دی۔ "روکتے نہیں ہو بھائی کو! نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔"

پیرل، "اسے کیا روکوں ماں!" کہہ کر خاموش ہو گیا تھا۔ بات تو خود اسے بھی اچھی نہیں لگی تھی لیکن روکنا اس سے بھی برا لگتا تھا۔ شام ہوتی تو ہر چیز سرگوشیوں میں بات کرتی نظر آتی تھی۔ ہر شے درخت، ہوا کے جھونکوں پہ جھکتے تو سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے اور ساکن ہوتے

تو سوچ میں ڈوبے ہوئے محسوس کرتا - ان حالات میں وہ کسی کو کیا روکتا -!

اسماعیل خان بھی ٹکٹ پکی کرنے کیلئے میدان میں کود پڑا - کہنے لگا "شہید کیلئے سر بھی حاضر ہے" ذیریں و بالائی طبقے مل گئے - باہمی تلخیاں کچھ عرصے کیلئے ایک طرف رکھ دی گئیں! اسماعیل خان نے صرف آسرا دیا بیٹا تو دو قدم اور آگے - اور گاؤں والوں کیلئے راستہ کھل گیا - غریب کیا چاہے اک ذرا سا سہارا - اب اس دن کا انتظار تھا جو ہماری تنظیم والوں نے بتایا تھا -

وہ دن بھی آیا - پورا گاؤں جمع ہو گیا - دو میل طے کر کے، وہ مین روڈ پر پہنچے پہلے دن وڈیرے کے بیٹے نے تقریر کی - دوسرے دن جالو نے پوری قوت سے نعرے لگے، روڈ پر گاڑیوں کے شیشے بکھر گئے - بیرل ابھی تک الجھن کا شکار تھا - ایک دل کہتا شریک ہو جاؤ دوسرا کہتا نہیں - لیکن وہ دوسرے دن سڑک تک گیا تھا - کیا کچھ نہیں - بس کھڑا دیکھتا رہا -

تیسرے دن سب نے سنا کہ پورے ملک میں آگ لگ گئی تھی، ہر چیز آگ و مٹی کے طوفان کی لپیٹ میں آگئی - پولیس لوگوں سے مل گئی - کہیں گولیاں چلیں، کہیں گولیاں چلانے سے انکار - جیل ٹوٹے - فوجی اور خانگی ٹرکیں جل گئیں - ریل کی پٹڑیاں اکھڑ گئیں بینک جل گئے -

پولیس ناکام ہوئی - ملیشا واپس ہو گئی - اب فوج ہی فوج تھی - فوج کے لشکر اور لوگوں کے بے قابو ہجوم، ہیلی کاپٹروں نے گولیاں برسائیں، مشین گنوں کے برسٹ مارے جلوسوں کی قطاریں گرتی اور بڑھتی گئیں، کھیت جل گئے - دھویں اور مٹی کے طوفان میں ننھا ننھا گاؤں کے دم گھٹ گئے - شیطان نے جھومر ڈالی - آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے آنکھوں اور جسموں سے خون ابلنے لگا - لیکن لوگ ... ... سوئے ہوئے - شیر جاگ اٹھے تھے - گاؤں، قصبے اور جنگل زخمی شیروں کی گرج سے کانپنے لگے ماں ڈر گئی - جگر کے ٹکڑوں کو آکاش کی طرف انگلی اٹھا کر قسم دی کہا "اگر بڑی سڑک تک گئے تو قیامت کے دن دودھ نہیں بخشوں گی"!

اس دن صبح سویرے ہجوم نے بڑی سڑک پر ملٹری کے پیلے رنگ کے دو لمبے ٹرالر روکے تھے ایک مشین گن نوجوانوں کے ہاتھ لگی - پر چلائے کون؟ کسی نے پہلے کبھی دیکھی ہو تو چلائے آخر توڑ کر جھاڑیوں میں پھینک دی - چچا مہر علی نے چمکتی ہوئی کلہاڑی سے ٹرالر کے پہیوں پر وار کیا کہا، "ایسی بندوق سے کلہاڑی اچھی"! ایک نوجوان نے مٹی کا تیل چھڑکا - دوسرے نے تیلی

دکھائی۔ چند گھڑیوں میں شعلوں کا جلتا ہوا وجود درختوں سے اوپر نکل گیا۔ دو گھنٹے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ خاکی گاڑیوں اور وردی والوں کا اُٹالہ مشین گنیں تانے کمرہ پہنچ گیا۔ نہ پوچھا نہ سنا، دیر ہی نہ کی۔ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ کسی نے کہا سو۔ کسی نے کہا ساٹھ۔

پھر دیہات گھیرے میں آ گئے۔ پانچ دیہات گھیراؤ میں آئے۔ ہر گھر میں گھسے آنگن ختم ہوئے۔ ہر چیز الٹ پلٹ دی۔ نہ چھوڑے برتن نہ بچوں کے کھلونے۔ مردوں کو چن چن کر گرفتار کیا۔ بچے، عورتیں، عزتیں ننگے سر ننگے پیر سخت دھوپ میں سنگینوں کی نوک پر مردوں کی آنکھوں سے چنگاریاں اٹھنے لگیں۔ کچھ تو گولیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ماں نے پیرل کو بھی گرتے دیکھا۔ کہرام بپا ہو گیا۔ خوفزدہ ماؤں نے جھپٹ کر اپنے بچوں کو سینوں سے چمٹا لیا۔

پیرل نے زخمی ماں کو دکھ سے نڈھال ہو کر قریب موجود سکینہ کا سہارا لے کر زمین پر جھکتے دیکھا تو برداشت نہ کر سکا۔ آگے بڑھنا چاہا تو جانو نے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔

دکھوں کا تندور دہکنے لگا تھا ہر ذہن انگاروں کی مانند جل رہا تھا اور ہر دل گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا تھا۔ کھیت چیخ چیخ کر جل رہے تھے اور تب، قرب وجوار میں موجود جھگیوں، مکانوں اور درختوں سے آگ، بارود کے ملے جلے دھویں، تپش اور دھماکوں کی گونج سے کئی پیرل اور پنچھی نفرتوں کے بیج اپنے ذہنوں میں اٹھائے ایک دن پھر واپس آنے کیلئے گھونسلے چھوڑ کر اڑتے چلے جا رہے تھے۔

نیا نقشہ

ف۔م لاشاری

چوراہے کے بیچ میں الگاس پر "وقت" لٹکا ہوا ہے۔ اس کا نہ مر سکنے والا جسم، لٹکتے لٹکتے تھک گیا ہے، اس کی باہنیں اوپر ہیں اور وہ اتنا اوپر لٹکا ہوا ہے جیسے کسی کو کئی سو گز گہرے بھری کنویں پر باندھا گیا ہو کہ نیچے دیکھنے سے سر چکرانے لگے اور اس کیفیت سے نجات بھی نہ مل پائے شہر کے باسی ٹوٹی ہوئی عمارتوں سے جھانک کر سہمی ہوئی نظروں سے لٹکتے "وقت" کو دیکھ رہے ہیں۔

شہر کے لوگ وقت کو مصیبت میں دیکھ کر روئے نہیں۔ چھوٹے بچے کبھی اپنے لاوے بھرے پہاڑوں جیسے بڑوں کو اور کبھی چوراہے پر لٹکتے وقت کو دیکھتے ہیں مگر کچھ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے خاموش ہیں۔ ان کو اس لمحے کا انتظار ہے جب انہیں نزور بولنا ہوگا۔

مسلسل لٹکتے رہنے سے "وقت" بے حد تھک گیا ہے باہنیں کندھوں سے کھینچی جا رہی ہیں اور سارا جسم بوجھ بنتا جا رہا ہے۔ اندر ہی اندر سینکڑوں بار وہ چنگھاڑا ہے مگر عذاب بڑھ رہا ہے اور عذاب کا سارا بوجھ گردن اور کانوں کے پیچھے جمع ہو رہا ہے

جہازوں سے بموں کی بارش نے ہر گھر میں سے کسی کو مارا ہے، کسی کو زخمی کیا ہے اور آدھی رات کو جب زخم قدرے سرد ہوئے تب سارا شہر اس گرم توے کی مانند لگتا ہے جس پر رکھی ہوئی ہر چیز بھن رہی ہو۔ شہر بھر میں چیخ و پکار کا عالم ہے اور "وقت" لٹکا ہوا ہے، اسے ساکت کر دیا گیا ہے۔ شہر کا ہر باسی کرب کے لیے اندھیرے مرکز پر کھڑا ہے جہاں وقت گزرنے کے احساس کی کوئی کرن ذہن کے کسی گوشے سے نہیں ابھرتی اور وقفے وقفے سے اچانک خاموشی کی مختصر سی

گھڑیاں زندگی کے شور کو تھپیڑ مار کر خاموش کرا دیتی ہیں۔ جیسے سارے زخمیوں کو خیال آجاتا ہو "ہم زخمی کیوں ہوئے ہیں"، مگر کوئی جواب نہ پا کر بنا کے آوازوں کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔

چیخ و پکار میں خاموشی آجانے کے مختصر سے وقفے میں سامنے والی عمارت سے پانی گرنے کی آواز سن کر "وقت" نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی... مگر اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بارود کے دھوئیں اور خون کے فواروں سے دھند سی چھا گئی تھی۔ مرتے ہوئے انسانوں کے خون نے فواروں کی شکل میں دشمن کے جہازوں تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے وقت کی آنکھیں دھندلا سی گئی تھیں، ورنہ وقت اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔

کسی چیز کے بہہ کر گرنے کی آواز نے اسے پھر بیقرار کر دیا۔ ذہن پر زور دیکر وہ سوچتا ہے "پانی کی دھار گرنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ اتنی گہری اور موسیقیت والی نہیں ہوتی۔"

وہ اپنے وسیع تجربے کو کام میں لاتے ہوئے تصور میں اس آواز کو سمجھنے کی خاطر آنکھیں بند کر کے غور کرتا ہے۔ قطروں کے گرنے سے ڈم... ڈم کے تاثر کے ساتھ ہلکی سی گونج پیدا ہوتی ہے۔ بہت دور سے بجنے والے نقارے کی آواز کی طرح" وقت نے سوچا۔

اس نے رگی کی مدد سے آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند کو ہٹانے کی کوشش کی، مگر اسی لمحے اس نے سامنے والی عمارت میں دیا سلائی جلتے ہوئی دیکھی۔ ٹوٹی ہوئی چھت کے نیچے سب سے اوپری منزل پر جوان مرد، عورت اور دو بچوں کی گہری خاموشی کی غاروں میں خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں، ایک معصوم بچہ اپنی مردہ ماں کے سینے پر مشینی انداز سے خون میں رنگے ہوئے ہاتھ چلا کر اپنی امی کو جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وقت کے ذہن میں خیال کی ایک لہر دوڑ گئی "زندگی نے اپنے معصوم اور بیگناہ روپ میں کبھی موت کو قبول نہیں کیا" لاشوں سے لکیریں بن کر، نقشہ بناتے ہوئے بہنے والا خون ایک جگہ جمع ہو کر، دھار بنا کر ٹپک رہا تھا اور اسی آواز نے اسے بے قرار کیا تھا۔

وقت کے حلق سے ایک بہت بڑی "چنگھاڑ" نکل جاتی ہے اور شہر کو گھیرے میں لینے والے ہڑبڑا اٹھتے ہیں۔

ایک بہت بڑی چیخ فضا کو چیرتی ہوئی، اندھیرے میں توپ کے چلتے ہوئے گولے کی طرح

بلند ہوتی ہے، جیسے کسی زمینی ستارے نے آسمان پر حملہ کیا ہو۔ اُس کے صبر نہیں ہو پاتا اور وہ پوری قوت کے ساتھ چیختا ہے "مر جاؤں .... میں مر جاؤں" گویا کسی کو حکم دے رہا ہو کہ اسے مار دیا جائے، دوسرے لمحے سامنے دیکھ کر وہ کانپ جاتا ہے۔

تیز رفتار بمباروں کی آواز بلند ہوتی ہے اور سارے شہر کی چیخیں اس میں دب جاتی ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیتی ہیں۔ جہازوں کے جھرمٹ سے بم اس طرح گرتے ہیں جیسے ہٹلر اپنے اوورکوٹ کے بٹن کھول رہا ہو۔ سینکڑوں گلے گھٹ جاتے ہیں، ہزاروں آنکھیں حرکت کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔

شہر کے مختلف علاقوں میں عمارتیں گرنے کی آوازیں بمباری کے بعد والے سناٹے کے سینے میں دھماکے کر رہی ہیں۔ لٹکتے وقت کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو دھاریں نکلتی ہیں مگر وہ اپنے آنسو پونچھنا نہیں چاہتا، کیونکہ شہر والوں کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں، اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور ٹانگوں سے چھڑیاں مار مار کر وہ اپنی تھکاوٹ بھی کم نہیں کر سکتا۔ کہیں پھر جہازوں کا زناٹہ نہ ہو۔ شہر سکتے میں ہے، اس حالت میں وہ بھنبھنا بھی نہیں سکتا۔ اپنی بے بسی پر غصے سے بھری ہوئی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے "میری بھنبھناہٹ پر کئی کانوں کی ڈھولکیاں پھٹ جاتی ہیں، مگر آج میری معمولی سی حرکت بھی جہازوں کے زناٹے اور ان سے نکلتی ہوئی سرخ لاشوں اور بموں کی بارش کا سبب بن سکتی ہے، کمال ہے!"

ریڈ کراس کی ایمبولینس گاڑیاں رکتی، ٹھہرتی، ٹوٹے ہوئے راستے صاف کرتی، رکاوٹیں ہٹانے کے بعد طبی امداد کے لئے آ رہی ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان ٹکراؤ میں موت کو غالب آتے ہوئے دیکھ کر ایک دفعہ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے ہیں "موت کتنی تیز رفتار ہے، اسے کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہوتی اور زندگی کی ایمبولینس گاڑیاں گلی گلی ہیں، موڑ موڑ پر رکتی ہیں کیونکہ راستہ صاف نہیں ہے" وہ اپنے آپ سے کہتا ہے۔

مہینوں سے شہر ٹینکوں اور فولادی گاڑیوں والی فوج کی جکڑ میں ہے، اور شہر کے کیڑے مکوڑے بھی گھٹ کر مر چکے ہیں، بازار ویران ہیں۔ اِدھر اُدھر چلاتے ہوئے کتے بے ربط آوازیں نکال رہے ہیں۔ ایسی تجریدی آوازیں جن کا کوئی مطلب نہ ہو پھر بھی ساری صورتحال کی عکاسی ہوتی ہو۔

آدھی رات گذر چکی ہے، شہر کے مغربی حصے کے ایک محلے سے کچھ آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں۔
"نانی آؤ، دادی آؤ، خالہ جلدی آؤ، سارا محلہ جان بچانے کے لئے نکل پڑا ہے۔ آدھا شہر ویسے بھی خالی ہے"
یہ عورتوں اور مردوں کی آوازیں تھیں۔

"میرے پاس رائفل اور کچھ گولیاں ہیں، میں گھر نہیں چھوڑوں گی۔" ایک ضعیف اور بوڑھی آواز آتی ہے۔ لہجے کا تاثر ایسا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

"دادی یہ رائفل ہوائی حملوں کو کیا کرے گی؟" کوئی بوڑھی کو سمجھا رہا ہے۔ "مگر میں کب کہتی ہوں کہ کہیں اور چل کر مروں، جتنا جینے کے لئے اپنا گھر ضروری ہے، مرتے وقت بھی وہاں ہونا اتنا ہی ضروری ہے۔"

لوگوں کے ہجوم پر خاموشی چھا جاتی ہے اور دوسرے لمحے سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ وقت کے جلتے ہوئے من پر جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کا مٹکا انڈیل دیا ہو۔ ریڈکراس کی گاڑیوں کے مقابلے میں یہ حوصلہ جو بوڑھی عورت کا روپ دھار نے دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا ہے، موت سے ٹکرا سکتا ہے۔

صبح کا تارا دیکھتے ہی وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ حرکت میں ہے، مگر وقت کی وہ حرکت کسی کائناتی رشتے سے ہوگی، یہاں کے جغرافیائی تعلق سے نہیں۔ "کائنات کے سارے سیاروں سے دھرتی مجھے زیادہ مشکل میں ڈالتی رہتی ہے، اور اس کا رن وہ اپنے دکھوں کو بھی بڑھاتی ہے" اگر شہر کے ہر گھر کے صبح والے ستارے کے اوپر سفید چادر پڑی ہے۔

پرچھائیں ہونے کے سبب اسے مرغوں کی اذانیں سننے میں نہیں آئیں، جو ہر جگہ صبح آنے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، وقت نے سوچا۔ "اگر یہ ککڑوں کوں کی آوازیں نہیں ہیں تو دن بھی نہیں ہوگا اور اگر ہو بھی گیا تو بن بلائے مہمان کی طرح ہوگا۔"

اچانک اس کے کانوں نے ایک جھنکار سنی۔ سر پھیر کے اس نے دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا ... اور دو گھڑیوں کی سانت چھا گئی۔ مگر ایک دفعہ پھر "اوہ نہ" کی آواز اتنے زور سے آ کر اس کی سماعت سے ٹکرائی جیسے کوئی پہاڑ دھاڑا ہو۔ ... اور اس سماعت میں اس کے لئے تڑپ سمائی ہوئی ہو۔ "سنتے کیوں نہیں"، اور وقت نے محسوس کیا جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھنا، سننا اور محسوس کرنا میری ذمہ داری ہے۔ لٹکتے لٹکتے اس نے حرکت کی، رسی گھومی اور وہ بھی گھوم گیا۔

شہر سے باہر فوجی کیمپ کے چاروں طرف ایک ایک درخت میں آٹھ آٹھ، دس دس لاشیں لٹکی

ہوئی تھیں، انسانی جسموں کے بوجھ سے درخت جھک گئے تھے، کچھ لاشیں گھوم رہی تھیں، اور کچھ جھول رہی تھیں، وقفے وقفے سے لاشیں درختوں سے گر رہی تھیں جیسے پک گئی ہوں اور درخت سے لٹکے رہنے کا جواز باقی نہ رہا ہو اور خون رس بن کر نکلا ہو۔

چنگھاڑ ایک خیمے سے نکلی تھی جہاں خیمے کے درمیانی کھمبے سے ایک نوجوان کو کھڑا کر کے باندھا گیا تھا، اسی خیمے کے دوسرے حصے میں کرسی پہ بیٹھا ہوا وردی والا شخص اونگھ رہا تھا۔ نوجوان کے جسم کا ہر حصہ جلا ہوا تھا، سر، کانوں، گلے اور ناک پر جمے ہوئے خون کی لکیریں تھیں، اور وقت نے ایک مرتبہ خود دھرایا۔ "خون کی لکیریں نقشے بناتی ہیں، چہروں، دلوں اور گھروں کے آنگنوں پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے نقشے مل کر ایک بڑے نقشے کو ترتیب دیتے ہیں، یہ ایک ایک آدمی، چھوٹا بڑا، عورتیں مرد، زندہ اور مرنے والے سب ایک بڑے نقشے کی تیاری میں مصروف ہیں، ایک نئے نقشے کی تیاری"۔ وقت نے آنکھیں بند کیے سورج طلوع ہونے سے ڈوبنے والے مقام تک آنکھ جھپک میں تصور کیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی "ساری دنیا کا نیا نقشہ بن رہا ہے۔"

نوجوان کے قدموں کے پاس جمع شدہ خون ابھی جما نہیں تھا، جسم سے خون اب بھی رس رہا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بیہوش تھا۔

سورج نکلتے ہی وقت نے مٹی کا غبار دیکھا۔ سامنے فوجی گاڑیوں کا قافلہ تھا۔ ہر گاڑی میں اسٹین گنیں تانے، فولادی خول والے سپاہی کھڑے تھے، وہ روشنی، خاموشی اور لاشوں سے ڈر رہے تھے، وقت سوچتا ہے "یہ اس قدر ڈرے ہوئے لوگ ہر حرکت کو قابو میں لانا چاہتے ہیں۔"

گاڑیوں کی آواز سن کر اونگھنے والا سپاہی لمبی جمائی لے کر اٹھا، اور اس کی نظریں بندھے ہوئے نوجوان پر جم گئیں، جو اس کی طرح انگڑائی لے کر نہیں اٹھ سکتا تھا۔ "اب کوئی بھی طاقت اس سے آنکھیں نہیں کھلوا سکتی۔ اب چاہے ساری دنیا کا جبر ایک جگہ لا کر جمع کر دو مگر یہ ضدی نوجوان آنکھیں نہیں کھولے گا۔"

الفاظ بھنبھناتے ہوئے وقت کا من جیسے پانی میں ڈوب رہا ہو، مگر دوسرے ہی لمحے وقت کے کان کھڑے ہو گئے۔ کئی ایک آوازوں نے مل کر ایک آہنگ پیدا کیا تھا۔

اُس نے اطمینان کی لمبی سانس لی یہ آوازیں ان ہزاروں قدموں کی تھیں جو شہر کی جانب سے چلے تھے۔ وقت نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ... ان آنکھوں میں ایک پیغام تھا،

جس میں بے بسی کی کوئی کیفیت نہیں تھی، شہر والے ہاتھوں میں بندوقیں تھامے آگے بڑھ رہے تھے۔

پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے شہر والوں سے مخاطب ہو کر وہ گرجا "اُوٗ" جیسے کوئی خلائی سیارہ زمین سے اٹھا ہو۔ اس کی گرج سے کئی گونجیں پیدا ہوئیں اور ہر گونج دوسری گونج سے زیادہ زوردار تھی شہر کے باہر فوجی کیمپوں کے پاس سینکڑوں بگولے گھیرا کرنے والے فوجیوں کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تیزی سے گھومنے لگے۔ ان کے کانوں کی ڈھولکیاں پھٹ گئیں۔ وہ دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھے، چیختے، پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔

وقت نے جسم کو جنبش دی، رسیاں ٹوٹ گئیں اور اس کے پاؤں دھرتی پر آگئے۔ جیسے اب تک وہ کسی شرط کسی مجبوری کے تحت بندھا ہوا لٹک رہا تھا۔ اُس نے اپنے جسم سے دھول صاف کی اور چل پڑا۔

بھٹائی کی تلاش

میر محمد پیرزادو

خیالوں کے ہجوم میں اس کا ذہن بھی کسی دوسری جگہ بھٹک رہا تھا۔ بور ہونے اور تنہا ہونے کا احساس برابر ہو گیا تھا۔ صرف جسمانی طور پر کمرے میں کرسی پر ڈھیلی پڑی ہوئی تھی۔ لیکن خیالوں کا بے لگام گھوڑا اپنی مرضی پر دوڑ رہا تھا۔ ان پیڑاؤں کی کٹھن بھاوناؤں سے پیچھا چھڑاتے ہوئے، انگڑائی لے کر جسم اور ذہن کو یکجا کر کے سوچتی ہے کہ باوجود اپنی کتنی ہی سُندر سوچوں اور بھاوناؤں کے ساتھ بھی انسان خود کو کتنا تنہا محسوس کرتا ہے۔ میرے خیال میری سوچیں، میری بھاونائیں، کسی کی موجودگی کے بغیر زیادہ ہوتے بھی تنہا ہیں۔ پُرمعنی ہونے کے باوجود بے معنی ہیں۔

"آخر کس حساب میں میرا ہونا (وجود)
ہوت (محبوب) کے بغیر ہوا ہے (بھٹائی)

.... اور سوچتی ہے اس آدمی پر جس کا چہرا سندھ کی تاریخ کی طرح بوڑھا اور جس کی ایک ایک جھری سندھ کی تاریخ کا دور لگ رہی تھی چاندی جیسے بالوں میں انگلیوں کی کنگھی ڈالتے ہوئے متفاطیسی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا تھا، "انسانی ذہن میں بھی ایک کیسٹ ہے جو اس کی زندگی کے تجربوں، ملاقاتوں، روٹھنے اور ہنسنے کے لمحوں کو ریکارڈ کیے دیتی ہے اور ان میں سے پیدا ہونے والے احساسات اور جذبات اس آدمی کی فطرت اور مزاج مطمئن کرتے ہیں۔ بلکہ کتنے ہی ویڈیو کیسٹ بھی موجود رہتے ہیں، جن میں وہ واقعات فلم بند کیے ہوئے ہیں جو بیتا ہے کتنے ہی عرصے بعد انسان اگر چاہے تو چلا کر دیکھ سن اور محسوس کر سکتا ہے۔" یہ سوچ آتے

ہی وہ چاہتی ہے کہ اگر حقیقتوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو ان کے عکس ریپیٹ کر کے کیوں نہ کچھ تاثر لیا جائے۔ ویسے بھی ہم اس قسم کا تاثر لینے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ حقیقتوں کے حصول کی بجائے ان حقیقتوں کے عکس بنا کر، اپنے خیالوں میں انہیں حقیقتیں سمجھ کر اور گھڑی بھر کے لئے ہی سہی سکون محسوس کرتے ہیں شاید جینے کے لئے۔ توازن قائم رکھنے کے لئے۔ کچھ کر سکنے کی مہلت کیلئے . . . اور سامنے والی دیوار پہ نظر ڈالتی ہے جہاں ٹیگور کے یہ الفاظ تختی پر لکھے لٹک رہے ہیں۔ "سورج نے غروب ہوتے وقت، کائنات پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا میرے بعد شاید اُس دنیا پہ اندھیرا ہی رہے گا! اور میرے سوا شاید کوئی بھی طاقت اس دنیا کو روشنی نہ دے سکے! اس وقت ایک جھونپڑی میں جلتے ہوئے اس کے چھوٹے سے دیئے نے گردن اونچی کر کے کہا! میں کوشش کروں گا!" سوچتی ہے سورج اتنا بڑا اور دیا اتنا چھوٹا لیکن اہم اور مشترکہ خاصیت روشنی، تاپ اور پھیلاؤ نہیں اور ذہن میں گھنٹے کی طرح بج رہا ہے یہ لفظ روشنی . . . . روشنی . . . . روشنی . . . !

اس گھڑی سے ٹائم دیکھتی ہے ساڑھے تین دوپہر، میٹنگ پانچ بجے شام کو ہوتی ہے ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پڑا ہے۔ میٹنگ پر جیسا کہ ابھی اکیلا ہی جانا پڑ رہا ہے۔ اس لئے کیوں نہ اپنے ذہن سے کوئی ویڈیو کیسٹ دیکھی اور سنی جائے۔ اور پھر ماضی کے دوستوں کی یادوں کے سائے میں ان کے ساتھ کہی سنی باتوں کے سہارے۔ آس . . . امید کے پھولوں سے بھری راہ سے، آگے چلا جائے اور وہاں پہنچا جائے جہاں میٹنگ ہوتی ہے جہاں پہنچنا ہے اور جہاں سے کنڈن ہوتا ہے۔ اور اس نے اپنے ذہن میں کسی ویڈیو کیسٹ کو آن کیا۔

کلاکار کا کمرہ جس کی محدود فضا میں سگریٹ کے دھوئیں کے گول گول دائرے، کولون کی خوشبو اور ایک فنکار کی سوچوں کے ابابیل اڑ رہے ہیں۔ کلاکار اپنے ہاتھوں کی لمبی انگلیوں کو آپس میں جکڑ کر توڑنے موڑنے لگا۔ اور پھر اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں ڈالتے ہوئے تیز نظروں سے اس کے چہرے میں گھورتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اس کے سامنے ہپناٹائز ہو چکی ہے۔ اس کے اندر والی جوبھن والی دیوی۔ اس کلاکار کے اندر کے کلا۔ آشرم میں آکر اپنے اندر کے کلا دیوتا کے چرنوں میں حسن، مہک، سولہ سنگھار، معصوم مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کرتی ہے۔

فنکار سے حساب ہی نہیں ہے ۔ فن کے آگے شکست کھا کر اپنے اندر کی حساس دنیا کی فتح محسوس کرتی ہے ۔ کلاکار کی تیز نظروں کے تاڑ سے کنتر اکراس کے کمرے کی دیواروں کی طرح پہرہ گھماتی ہے پہلے ہی جس تصویر پر نظر پڑتی ہے اس میں دکھایا گیا ہے ۔ کنول کے پھول پر دھرتی کا گولا کھڑا ہے اور کنول کے پھولوں کی پنکھڑیوں میں سے شراب کی بوندیں پھواروں کی صورت دھرتی پر پڑ رہی ہیں ۔ لیکن اس ساری صورتحال کی ادائیگی اس کاریگری سے کی گئی ہے کہ دیکھنے والا اپنے جسم پر ان پھواروں کی ٹھنڈک، خوشبو اور سکون اور لذت محسوس کرتا ہے ۔

ساتھ ہی ایک تصویر میں ایک قدآور انسانی جسم پر سور کا سر لگا ہوا ہے ۔ جو ایک راگی ٹوٹے ہوئے ساز پر پاؤں جمائے اور اس کے سینے میں دانت گاڑے کھڑا ہے اور اس تصویر کے پس منظر میں بہت سے راگیوں کے دھندلے عکس دکھائے گئے ہیں ۔ فن اور جبر کی ٹکر، راگ اور روگ کا آمنا سامنا، سچ اور جھوٹ کا مقابلہ اور پس منظر میں راگ، فن اور سچ سربلند کھڑے دکھائے ہوئے ...

اچانک وجدانی کیفیت سے کلاکار کی آواز ۔ عدم سے آنے والی آواز لگ رہی تھی ۔

"سا فن کو تم ذرا سمجھاؤ، خواہ مخواہ کیوں اپنی خوبصورت زندگی گنوانے پر تلا ہے ۔ یہ دھوکے اور فریب والے لوگ تو آتے جاتے اسے ملتے رہیں گے ۔ لیکن زندگی کا گنوایا ہوا ایک دن بھی اسے واپس ملنا مشکل ہے ۔"

"گنوایا ہوا ... (ٹ... چپ) ... ایک لمبی سانس، فن کی دنیا سے پیوستہ ۔ نیند بھرے نینوں میں آنسو ۔ جیسے نین نیند میں سے جاگ کر منہ دھو رہے ہوں اور پھر بھاری پلکیں اٹھتی ہیں ۔ ذرا سا گردن جھکنے والا جھٹکا ۔ جیسے کلاکار کے آگے نمستے اور اس گھڑی، پہلے شکست کھایا ہوا فاتح اور فاتح شکست کھایا ہوا الگ رہا تھا ۔ دھیمی آواز سے "وہ تو کہتا ہے کہ زندگی کے ہر لمحے، ہر گھڑی اور ہر پل کا مان اسی میں ہے کہ وہ اجتماعی کام کیلئے قربان ہو ۔ اس لئے کہ کوئی چیز پیاری اسلئے نہیں ہوتی کہ وہ اپنی طرف کھینچتی ہے بلکہ اس کے پیاری ہونے اور مہان کا سبب یہ ہے کہ وہ کونسا سماجی کام ادا کرتی ہے ۔ اے کلاکار مجھے آپ کے فن اور اس کی باتوں نے مست بنا دیا ہے ۔ دن میں آپ سے اور رات میں اس سے باتیں کر کے میں نے اپنی زندگی کا صحیح مان اور مرتبہ جانا ہے ۔"

"نہیں چمپا! یہ قربانیوں اور اجتماعیت کی باتیں کرنے والے کتنی سازوں اور سُروں جیسی پیاری زندگیوں کو اپنی خودغرضیوں کا بلیدان بنا کر اپنی سیاستیں کرتے ہیں۔ فائدے حاصل کرتے ہیں۔ کیا ساون بھوکوں مرتا ہے کہ بھوک کی باتیں کرتا ہے۔ انٹر سائنس پری میڈیکل اے۔ ون میں پاس کرنے والا ساون، کیا روڑوں پر لاٹھیاں اور کنڈاک کھائے گا۔ دھکے کھائے گا۔ جیل جائے گا اور ایک دن مر جائے گا یہ ہے زندگی کا مقصد اور معنیٰ۔ یہ اسے اپنے عقلمند اور دانشور سمجھاتے ہیں اور کچھ نہیں ہے بس۔ اس کی کچی عمر کی جذباتیت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ عمریں تباہ اور زندگیاں برباد کرنے کیلئے دکان کھولے بیٹھے ہیں۔

ان کے نعروں کے دھندلکوں میں حقیقتیں چھپ تو جاتی ہیں، ختم نہیں ہو جاتیں۔ بعد میں جذباتیت ختم ہو جاتی ہے تو وہ ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن وقت گذر چکا ہوتا ہے۔ چمپا، کیا ساون کی آنکھ میں خوبصورت آنکھوں کے معیاری قدروں میں سے کس قدر کمی ہے۔ اس آنکھ کو پیار کے امرت کی ضرورت ہے۔ آنسو گیس کی چبھن اور سنگین کے نوک کے چبھن کی نہیں۔

نچلے ہونٹ کا ایک حصہ دانتوں کے بیچ میں۔ سگریٹ کی تیلی۔ آنکھوں پر انگلیوں کا دباؤ اور پھر دھواں بھر جانے سے بہہ جانے والے آنسوؤں کو صاف کرنا۔

"نا پر تمہاری اور تم جیسے کتنے ہی دوسروں کی کلا اور محنت، مشقت اور پیٹ کے ٹھرنے بھی اگر کوئی اثر دکھایا ہے تو وہ یہ کہ اس نے ساون پیدا کئے ہیں۔ کیا تم لوگ اپنی تخلیق رچتے کوئی فن پارہ پیدا کرتے اس کے پڑنے والے اثرات پر اور ان اثرات کے منطقی نتیجوں پر نہیں سوچتے کیا؟ مجھے تم لوگ اس مالی کی طرح لگتے ہو جو آم کا پودہ تو لگاتا ہے لیکن جب وہ پودہ بڑا ہو کر آم دینے لگتا ہے تو اس پکے ہوئے لال لال آم کو دیکھ کر بوکھلا اٹھتا ہے کہ یہ کیوں پیدا ہوا، اس نے تو سارے درخت کا ستیاناس کر دیا، یہ کیا ہو گیا! پیارے کلاکار! اگر ایسا ہے تو کینوس بیچ کر کوڑھی لے لیں جس سے آپ خوبصورت خوبصورت پرندوں کی آزاد اڑان کو روک سکیں، برش اور رنگوں کو بیچ کر ایک قینچی خرید لیں کہ کسی کی جیب آسانی سے کاٹ سکیں اور مالِ غنیمت پر آرام سے گذارہ کر سکیں۔ معاف کیجیے گا میں آپ کی کافی عزت اور احترام کرتی ہوں، لیکن آج جو الفاظ میں کہہ رہی ہوں وہ میرے اعتماد پر لگنے والی چوٹ کا ردعمل ہیں۔ اس لئے ان کی کڑواہٹ کو

برداشت کیجئے گا۔"

"نہیں... نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں چھپا! دراصل ہم فنکار ہیں ہی کسی ایسے بِن ماں باپ کے بچے کی طرح، کہ جس کے سر پر اگر کوئی بھی ہاتھ رکھ لے تو پورا دل اس کے سامنے کھول کے رکھ دیتا ہے، میں نے تم سے اپنے اندر کی انتہائی گہری اور نہ کرتے جیسی باتوں کا بھی اظہار کیا ہے۔ تمہاری طرف سے اس کا اصرار تو نہیں ہوا تھا کہ میں اب ان کا دفاع کرتے بیٹھ جاؤں گا۔ یہ تو میں نے خود تمہارے سامنے پیش کی ہیں اور اس لئے یہ تمہیں بھی اختیار ہے کہ تم ان سے اتفاق نہ کرو اور اس کا اظہار تم جن الفاظ میں بھی، چاہو کرو، خود ساون کی طرف سے میری پریشانی کا کارن بھی تم ہی ہو۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ تم اسے دل کی کتنی گہرائیوں سے چاہتی ہو اور خیالوں ہی خیالوں میں تم نے جو کاک محل تعمیر کئے ہیں ان کو دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے اندر میں بچی سیج کہ جس پر صرف ساون ہی بیٹھ سکتا ہے کہیں رلنے کیلئے موہل کی سجی سیج نہ ثابت ہو۔ شاید چارپائیوں پر گرد جم جائے اور پلنگ پرانے ہو جائیں۔ تمہارے اندر کی کاک پر کانگیں ہی نہ پہنچتے رہ جائیں اور آنے والے وقت میں تمہاری اس حالت پر سوچتے میں بار بار ساون کی چال چلن پر تنقید کر بیٹھتا ہوں۔ ورنہ میرا کیا اگر کل خیرپور ناتھن شاہ میں ایک سو آدمی مر جاتے ہیں یا سکرنڈ کے قریب پچاس کے لگ بھگ آدمی مر گئے۔" بے چین... پریشان.... جذباتی ... بے قراری۔

چائے کی پیالی سامنے... خاموشی کے منہ لگی سپ سپ کی آواز... دو وجود... دو جسم۔ لیکن چپ تو جیسے کچھ ہے ہی نہیں... اب دو... دو الگ دنیائیں۔ ایک کمرے میں لیکن ایک دوسرے سے کوسوں دور۔

"ہاں تو کلا کار سرکار! جیسے جیسے بات بڑھتی ہے آپ کی باتوں اور خیالوں کے اظہار سے ایسا لگتا ہے کہ آپ خود اپنی اصل اور حقیقی ذہنیت کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ ساون کی بات تو اپنی جگہ لیکن یہ دوسری دو باتیں کیسے کہ "خیرپور ناتھن شاہ میں جو لوگ مارے گئے اور سکرنڈ کے قریب جن کی جان چلی گئی ان سے میرا کیا۔" تم فنکار ہو۔ کلاکار ہو تمہارے دل کے ساز کی تاریں تو جب ہی ٹوٹ رہی تھیں جب کسی زمیندار کی سازش پر شیدو ڈاکو مارا جا رہا تھا، بود اداء بدنام کیا جا رہا تھا اور بدمعاش ، کہانی کے روپ میں یہاں کلا فنکار ... تو

اس ڈاکو کے مارے جانے پر احتجاج کر رہا تھا۔ کیا خیرپور ناتھن شاہ والے لوگ کسی لڑکی کے رشتے کی وجہ سے آپس میں لڑے تھے۔ یا کسی سردار کو چننے کیلئے اختلاف رائے کی وجہ سے لڑکر مر گئے یا سکرنڈ کے قریب لوگ پانی کی باری پر لڑ مرے تھے۔ مرنا تو تجھے بھی ہے اور مجھے بھی۔ اور مرنا تو ساون کو بھی ہے۔ رہے گا کوئی بھی نہیں لیکن یہ بھی تو تم جیسے ہی کسی فنکار نے کہا ہے۔"

سچ اور جھوٹ کے جھگڑے میں کس کے ساتھ ہونا چاہتے ہو۔
تم بھی نہ ہو گے
میں بھی نہ ہوں گا
صرف (خیالوں کی) خوشبو پیچھے رہ جائے گی
کیسی خوشبو تم اپنانا چاہتے ہو۔
تم دنیا میں کیسے جینا چاہتے ہو۔

کیا یہ مار دھاڑ جس میں کوئی ذن خالی نہیں ہے اس میں جب تمھارے فن کے اصل کردار اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ تب آپ کا کترانا اپنے فن سے، فن کے محرک جذبوں سے، ماحول سے، اپنے آپ سے دھوکہ نہیں۔ جب کہ تین سو سال پہلے "لطیف" اپنے لوگوں سے، ملک سے عوام کی معصومیت سے، ہر لمحے، ہر پل، اور ہر معرکے سے اتنا طرفدار رہا کہ نادر شاہ کے مظالموں کے خلاف کہا۔

دکھی کو ہنسی نہیں آ رہی، بھوکی کا جی بیٹھ گیا ہے
ننگی کو شادی کی ساری خوشیاں بھول گئی ہیں

نہ پودوں میں وہ کپاس ہے اور نہ ہی وہ کاتنے والیاں ہیں
یہ ساری بازاریں دیکھ کر میرا من نمک کی طرح حل ہو رہا ہے

شاہ عنایت جھوک والے نے کسان تحریک شروع کی تو لطیف اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ہمارے سجن، ساون کی گھٹا کی طرح جھوک کے قریب ٹوٹ پڑے ہیں
وہ سارے میدان سیراب کریں گے، اپنی بارش کے نالے سے
وہ لوگوں کو، اپنی آنکھوں کو ابرآلود کیئے بے انت پانی پلا رہے ہیں"

یا اس تحریک کے کچلے جانے اور شاہ عنایت کے شہید ہو جانے پر کہتے ہیں،

"میری ماں! میں اپنے سنگھاردں کی جھوک دیکھ کر ٹوٹ رہا ہوں"

اس نے تو ایسے، کتراتے، بھاگتے اور سوتے ہوئے فنکاروں کیلئے کہا ہے۔

"یہ بجانے والوں کی شان نہیں کہ ساز دیوار پر لٹکا دیا ہے
اس خوبصورت صبح سے کیوں بیر لگائے بیٹھے ہو
تمہیں اس ساز کے بغیر، بجانے والا کون کہے گا"

اور آج جب سارا ملک جل رہا ہے، ماؤں کی گود خالی ہو گئی ہے، بہنوں کے اپنے بھائیوں کے لیے گائے ہوئے گیت نوحے بن گئے ہیں۔ ودھواؤں کی چوڑیاں ٹوٹ کے بکھر گئیں ہیں۔ نتھ ناک سے اتار کر پھینک دی گئی ہے۔ تب آپ کے کینوس پر ادھ ننگی عورت کا دھندلا عکس نظر آرہا ہے اور آپ کی ساری صلاحیتیں کھوج لگانے میں مصروف ہیں کہ کون سے رنگ استعمال کیے جائیں اور کون سا پس منظر نکالا جائے کہ جیسے یہ ادھ ننگی مدر گاڈیس ایک الف ننگی عورت والی جنسی کشش والی ساری ذمہ داریاں پوری کرسکے۔

تو اے پیارے کلاکار! تم نے جو تین سو سال پہلے ذمہ داریاں اور سماجی جوابداریاں پوری کی تھیں۔ میں تمہاری امرتا اور مہانتا کے ؟ سمائے ہوئے تھے۔ جن میں سے تین سو سال گذر جانے کے بعد بھی وہ امرتا اور مہانتا، عقیدت اور احترام چٹکی برابر بھی کم نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس عقیدت اور مہانتا کی لکیر فن کے گراف پر اونچی گئی ہے اور اس فن کی عظمت اور سماج کی طرف جانبداری کی وجہ سے تم نے سندھی میں لطیف کی صورت میں جذبات کی دنیا پر تین سو سال سے راج کیا ہے۔ جو کہ ابھی تک جاری ہے اور جاری رہے گا۔ یہ اس فن کی موجودگی ہی کا سبب تھا کہ نعرے بازی کو مات ہوئی۔

لیکن اس کے برعکس تمہارا اس روپ میں کلاکار بن کر آنا اور وقت کے ابھرے ہوئے

تضادات کے سامنے شتر مرغ کی طرح منہ چھپانے والا کردار، سماجی کا رخ سے آنا کترانا، کہ جب بہنوں کے اپنے بھائیوں کے لئے گائے گیت نوحے بن جائیں اور بیٹوں کو دی ہوئی لوریاں بین میں بدل جائیں۔ تب تمہارے کلا کینوس پر ادھ ننگی عورت کے جنسی نمائش والے چتر کا ابھرنا تمہارے فن کی دنیا میں زوال کی نشاندہی کرتا ہے اور جب فنکار کا زوال ہوتا ہے تب فن کی جگہ نعرہ لے لیتا ہے قلم کا کام کنڈاکوں سے لیا جاتا ہے اور...."

"بس! بس چمپا یہ.... یہ تقریری موضوع نہیں کہ جس کی مخالفت اور حمایت میں بولا جائے دراصل بات یہی ہے کہ وہ جو آج سندھ میں لڑ رہے ہیں اور وہ جو ان کے مدمقابل ہیں دونوں نے پیار نہیں کیا ہے، ان کے انتظار میں کوئی دیئے جلائے نہیں بیٹھی، ان کا ہر ایک لمحہ صدیوں پر بھاری نہیں گذرا اور شام جو اپنی ساری کو ملتاؤں اور رعنائیوں اور مناظر کا کاک ٹیل بن کر ان کے سامنے نہیں آئی۔ ان کو کسی دل کے ملاپ، قہقہوں کی موسیقی اور بھولے بھالے بولوں کی معصومیت میسر نہیں ہوئی۔ اس کائنات میں باشعور اور اندر کے جذبوں کی آگ میں جلنے والے انسان کیلئے اگر کوئی نجات دلانے والا ہے تو وہ پیار ہے اور اگر کوئی سکون بخشنے والی جگہ ہے تو وہ کسی کی دو باہوں کے بیچ میں ہی ہے۔ اس کڑے کوس میں اگر سائے کی ذرہ برابر بھی امید ہے تو وہ کسی کے گھنے چمکدار گیسوؤں کے سائے ہی میں ہے۔ یہ دوڑ بھاگ، جھگڑے لڑائیاں، اس لئے ہیں کہ کوئی ٹھوس اور دائمی سہارا ملے، جس سہارے کے تحت زندگی کے سندر لمحوں کو تیاگنے کے حوالے سے نباہ کیا جاسکے اور یہ سارا صرف پیار ہی کے ذریعے مل سکتا ہے، پیار.... کسی انسان کا پیار ہی یہ قوت رکھتا ہے کہ دنیا کی دوسری ساری ضروریات سے آزاد کر سکے۔

ان دونوں کے درمیان یہ جنگ چاہے بظاہر کسی بھی وجوہات کی بنا پر ہو دراصل پیار کے فقدان کا نتیجہ ہے، اس پیار کے جس کے بغیر انسان ادھورا ہے۔ اور اس ادھورے پن کی وجہ سے وہ انسان کم اور حیوان زیادہ رہتا ہے جس وجہ سے اس کی یہ "حیوانی جبلتیں" ابھر آتی ہیں اور اسے ٹکراؤ میں لاتی ہیں جس کی وجہ سے انسانی تہذیب میں زلزلہ آجاتا ہے۔ اور تباہیاں ہوتی ہیں اور جب ان دونوں میں یہ حیوانی جبلتیں اتنی تباہی اور خون خرابہ کے بعد تھوڑے وقت کیلئے دھیمی پڑجاتی ہیں تو ذرا ماحول سازگار ہو جاتا ہے اور پھر جب کچھ وقت گذرنے کے بعد ابھرنے لگتی

ہیں تو پھر وہی دنگے اور فساد۔ ہم فنکاروں، کلاکار اور سوچنے والوں کا کام ہے کہ اس بات کا سبب معلوم کریں تاکہ سطحی سوچ کے تحت اس رو میں بہہ جائیں۔ اس لئے میں بار بار پیار کی اہمیت کے بارے میں اہمیت اور وچار پیش کر رہا ہوں۔ جس کے ذریعے سادھن اور چھپا ایک دوسرے کے لئے اوتار بن کر جی سکتے ہیں۔ پیار کے سوا دوسرا کون سا سہارا ہے جو انسان کو سکون کی ضمانت دیتا ہو۔۔۔؟"

"آپ کی ساری باتوں کو کان لگا کر سننے کے بعد مجھے اپنے چاچا عرس موالی کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ رات حقہ پیتے چاچا عرس موالی سے جو ان کی طبیعت پوچھی تو انہوں نے کہا کہ بخار اور کھانسی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس گیا تھا لیکن مدالی مار جوان جلوس والوں پر سارا شہر ہی بند کروا دیا۔ ڈاکٹر نہیں مل سکا۔ فی الحال کچھ گولیاں لی ہیں۔ تو ان خیر! تو صبح جا کر ڈاکٹر احوال کروں گا۔"

میں نے پوچھا "چاچا! آخر ان جلسے جلوسوں والوں، جھگڑے والوں اور ان سے جھگڑنے والوں کو کس طرح منایا جا سکتا ہے۔"؟

چاچا عرس موالی آدمی لمبا کش لینے کی وجہ سے کھانسی کے دورے میں ہی ڈوب گئے ذرا سانس لی تو کہا۔

"بیٹا! چودھویں صدی پوری ہو گئی ہے۔ یہ ہے پندرھویں صدی، دوسرا بچگانہ عادت کو کون بس کر سکتا ہے، لڑکے لڑکے اکٹھے جمع ہوتے ہیں کسی جگہ میں لاٹھیاں کھاتے کھاتے اپنے کو مروا رہے ہیں۔ حکومت سے لڑنا ہے پہاڑ سے سر ٹکرانا۔" یہ تو تھے چاچا عرس موالی کے الفاظ، وہ روایتی الفاظ جو اس عمر کے لوگ عام طور پر کہتے ہیں۔ لیکن چاچا کی ایک اور بات ابھی مجھے یاد آئی ہے وہ یہ کہ چاچا نے ذرا قریب ہو کر آہستہ سے کہا۔ "بیٹا ان دونوں کو ایک ایک گھونٹ بھنگ کا اگر پلا دیا جائے تو آرام سے سو جائیں۔ پھر کاہے کا جھگڑا!" تو جناب معاف کیجیے گا نسخہ تقریباً وہی ہے جو کہ رات چاچا عرس موالی نے بتایا تھا اور اب آپ بتا رہے ہیں لیکن افسوس چاچا عرس موالی یہ نہیں آپ پر ہو رہا ہے۔ "بھنگ" ..."پیار" اصل مسئلے سے منہ موڑنے کے دو بہترین دھوکے۔ صاحب ڈھلہ کو ہم تھپانے کے چاہے شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر دو بہترین گُر۔ فاقہ میں بھنگ بھی مزا نہیں دیتی۔ فاقہ کشی ایک عجوبہ

کا حسن بھی قائم نہیں رہتا۔ یہ پیار پیٹ بھرائی کے خسیس پیرچار کے سوا کچھ نہیں۔ جب فن، چرس اور گانجے کا ایک کش بن کر رہ جاتا ہے۔ تب تین سو سال ماضی میں غوطہ لگاتے ہوئے میرے من کی ہرنی تھو ہر، تھو ہر کرتی اس فن کے چشمے "لطیف" کو ڈھونڈ لیتی ہے جو کہہ رہا ہے۔

"وہ پانی کا بے انت سلسلہ لوگوں کو اپنے کو آبدیدہ بنائے لیا رہے ہیں"

"لس پیاندہ لوک، آگم کیو اکین سین۔"

وہ سامنے دیکھتی ہے ایک پینٹر لٹک رہا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ دھرتی کا گولہ کنول کے پھول پر رکھا ہوا ہے اور کنول کی پنکھڑیوں سے شراب کی بوندیں نکل کر پھواروں کی صورت میں دھرتی پر پڑ رہی ہیں۔

وہ پھیکی مسکراہٹ سے، دل ہی دل میں کہہ رہی ہے آج تو دھرتی ابلتے ہوئے ایٹمی کیس پر پڑا ہوا ہے۔ کنول کی پتیاں وہ اسلحہ کی فیکٹریاں ہیں جن میں سے میزائل، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نیوٹران بم قطار در قطار دھرتی کے گولے پر پھواروں کی مانند برس رہے ہیں۔

پھر جب دوسری جانب دیکھتی ہے تو وہاں لٹکی تصویر میں ایک قد آور انسان ہے۔ جس کی گردن پر سور کا سر ہے اور جس کے پاؤں میں ٹوٹا ہوا ساز پڑا ہے اور جس نے دانت راگی کے سینے میں گھونپا ہوا ہے۔ پس منظر میں کتنے ہی سازوں سے راگی دھندلے دھندلے دکھائے گئے ہیں، جس کا تاثر یہ ملتا ہے راگ اور روگ کے مقابلے میں بظاہر تو روگ کی فتح نظر آ رہی ہے لیکن پس منظر میں کتنے ہی سازوں والے راگی سر اونچا کیے گا بجا رہے ہیں، گویا اس سور صفت درندہ انسان کے آگے چیلنج پیش کر رہے ہیں کہ تم کتنے راگیوں کے سینوں میں اپنے دانت پیوست کرو گے اور کتنے سازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دو گے۔ جبکہ ایک راگی اور ایک ساز میں سے اتنے راگی اور اتنے ساز جنم لے چکے ہیں ... یہ ہے تو حقیقت، لیکن تخلیق کار کی سوچ کے مطابق تو الٹ دکھائی گئی ہوتی کہ سور کے سر والے انسان کو راگی خواہ ساز اور راگ سنا کر بیزار کر رہا ہے۔ مار رہا ہے اور پس منظر میں کتنے ہی سور کے سر والے درندہ انسان جنم لے رہے ہوتے تاکہ اس کا موجودہ موقف مایوسی اور فراریت والا تاثر ابھرتا۔

"اتنی خاموشی سے مر لو بیزاری تو نہیں۔"

"نہیں سوچتی ہوں کہ کاش میں تمہاری طرح کلا کی دھنی ہوتی تو ایک تصویر بناتی جس میں حسن، سندرتا اور پیار کی ایک ایک مورت ٹہنی پر پھول کی طرح کھلی دکھاتی اور ان ساری ٹہنیوں کی واپسی ایک ہی تنے کی جانب ہوتی۔ وہ تنہ ہوتا "گندم کی پکی ہوئی بالی"

ویڈیو کو "آف" کر کے وقت دیکھتی ہے۔ ساڑھے چار۔ ویڈیو بہت مزیدار تھی اور زندگی کا ثمر معلوم ہوتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کیلئے اسے پھر "آن" کرتی ہے۔

بہت دنوں سے کلاکار کی طرف نہیں جا سکی ہے۔ درد کے پہاڑ گر پڑے ہیں، زندگی کے بھلیس کو درد کی مناسبت سے کالا کرنے کی کوشش کی تو سرخ ہو گیا۔ پیارسب کچھ نہیں کہہ رہے! یہاں کنفیوز ہو گئی، زندگی کے دوگانے سے ایک آواز۔ مرد کی آواز بند ہو گئی تو دکسی کا سہارا بننے والا کردار، بے سہارا محسوس کرنے لگا۔ ساون گرفتار ہو گیا۔ ٹارچر سیل میں مارا گیا۔ عید کے دن اور محرم کی دسویں میں یکسانیت سمجھ میں آگئی۔ یہاں، سکھ اور سچ کی دیوی حاصل ہونے کیلئے کتنے ہی سکھ اور سچ کی دیویوں کے بلیدان مانگتی ہے۔ ایسے بے شمار سوالات سر اٹھائے بڑھ رہے ہیں اور ساون کا ٹارچر سیل کی جانب جاتے جاتے بھیجا ہوا پیغام۔

"اپنی محبت، مقصد پانے میں مضمر ہے۔ ہم "ساون" اور "چمپا" نہیں رہے تھے لیکن ایک صدا بن کر گونج رہے تھے جو گونج جاری رہنی ہے اور جاری رہے گی۔ ویسے بھی "چمپا" کا کھلنا "ساون" کے ہونے اور "ساون" کا ہونا "چمپا" کے ہونے کی ثابتی ہے۔ تم خود کو اکیلا نہیں محسوس کرنا لیکن مقصد کو اپنا ساتھی سمجھنا۔ سینٹرل کمیٹی پر میری خالی کی ہوئی جگہ پر اگر تمہارے تقرر کا فیصلہ ہو تو وہ قبول کرنا۔ مطلب کہ کوئی غم نہیں کرنا۔ ہم ہمیشہ "ہو جالو" میں "جبر سے جینے والے" بن کر گائے جائیں گے۔ صرف مقصد سے سچائی کی وجہ سے! معصوم بچوں کے قہقہوں، بہنوں کے گیتوں، ماؤں کی لوریوں، سہاگنوں کی نتھوں اور چوڑیوں کی جھنکاروں اور وطن کے پیار بھری ہیر اور خوشبوؤں میں زندہ رہیں گے۔ میری یہ سطریں اپنے کلاکار دوست کو بھی پڑھانا۔ اس کے فن کے لئے اگر خام مال کا کام بھی دیا تو بھی ہمارے لئے بہت کچھ ہوگا۔"

جدوجہد، مسکراہٹ، بھوک۔ مسکراہٹ، لغزشیں، مسکراہٹ، رشتے داروں کی موت، مسکراہٹ، میرے دکھ، مسکراہٹ اور آج وہ مسکراہٹ، ہاں! آج وہ مسکراہٹ بجلیوں کی چمک میں ہے۔ ظلم اور جبر کے پہاڑوں میں پڑتی دراڑوں سے وہ مسکراہٹ جھانک رہی ہے۔ بھٹائی اور خلیفہ نبی بخش کے کیڈاروں سے وہی مسکراہٹ ناچتی دکھ رہی ہے۔

تیسرے دن پڑوس کا ایک لڑکا آیا۔ پھولتے سانس سے بتایا چاچا سازنگ مرگیا۔ وہ اچھل گئی۔ کیا کلاکار سازنگ، اپنی کلا کی دنیا میں چلا گیا۔ اتنی جلدی اس طرح۔ پتہ چلا کہ اس کی موت زیادہ تعداد میں نشہ آور گولیوں کے کھانے سے خودکشی کے ذریعے ہوئی۔ گویا زندگی کی ناچتی گاتی اور جذبات سے بھرپور دیوی کی تصویر کو ایسے کالے رنگ میں ڈھانپ لیا۔ جیسے اپنی تخلیق کی ہوئی کتنی ہی تصاویر سے کیا کرتا تھا۔

کیسٹ کا بٹن آف

پانچ بجنے میں دس منٹ ۔۔ سفید کاغذ ۔۔ قلم ۔۔ سوچیں ۔۔ چمپا ۔۔ راستہ ۔ سینٹرل کمیٹی کی میٹنگ ۔

سفید پھولوں کے خواب

شاھد بُھٹو

سندرتا سے پُر میدان - میدان میں پھیلا ہوا سبزہ زار۔ چاروں طرف آہنی دیوار۔ دیوار پر
بار بیڈ وائر۔ تاروں میں دوڑتا ہوا کرنٹ ۔ دھرتی میں پیوست سنگین ہراساں چہرے۔ کونوں میں
بندھے ہوئے لوگ منہ میں ٹھونسے ہوئے کالے کپڑے، آنکھوں میں اُترا آیا ہوا خون، سانس رکی
ہوئی، تڑپتے ہوئے جسم -

وہ اُس شہر میں پہلی دفعہ آیا تھا، شہر کیا تھا وہ حیرانی سے ہر آنے والے چہرے کو گھورتا
رہا۔ پیلے پیلے ہلدی مائل چہرے کمزور۔ نحیف ....

گلیاں سنسان ....

کیا اس شہر میں بچے نہیں ہوتے .... ؟

نہیں اس شہر کی مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو گھر سے باہر جانے نہیں دیتیں ...

کیوں .... ؟...

تمہیں نہیں معلوم اس شہر کی کھڑکیاں جبراً بند کروادی گئی ہیں، ہر کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں
اور جالیاں لگوادی گئی ہیں تاکہ باہر کی تازہ ہوا اندر نہ آجائے اور اس شہر کے خاکی کتے ہواؤں کو سنگینوں
سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تم بتاؤ ... ہوا کو کوئی روک سکتا ہے

... * ...

سامنے چارپائی پر آلتی پالتی بیٹھی ہوئی عورت، گھٹنوں پر لیٹا ہوا۔ بچے کا چہرہ ماں کے چوڑے

سے ڈھکا ہوا۔ دودھ کی چسکیاں لیتا ہوا۔ کافی دیر سے دودھ پی رہا ہے پر بھوک نہیں، مٹی بچوں کے منہ نکلنے پر مائیں انہیں ڈانٹ کر پھر زبردستی کیوں پلانے لگتی ہیں۔

اس لیئے کہ وہ جلد بڑے ہو جائیں۔

... * ...

دروازے پر بچے کھیل رہے تھے، میں نے ان سے راستہ پوچھا کسی نے جواب نہ دیا تنقصے سے میں نے ایک بچے کو جھنجھوڑا۔ اُس نے جواب کیلئے منہ کھول کر دکھایا

سیاہ زبان۔ آدھی کٹی ہوئی...

ہاں... یہاں بچپن سے بچوں کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں۔

لیکن کیوں.....؟...

... * ...

یہاں کی دیواریں رنگوں سے بھری ہوئی کیوں ہیں...؟

یہاں کے نوجوان۔ رات کے اندھیرے کے خلاف دیواروں پر سُرخ رنگوں سے نقش بناتے ہیں، جس کی خوشبو اس شہر کی ہر گلی اور ہر گھر میں پہنچ جاتی ہے۔ لیکن وہ بے وقوف اُس خوشبو کو بھی سنگینوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بھلا بتاؤ! ...کوئی خوشبو کو سنگینوں سے روک سکتا ہے۔

... * ...

رات ہونے کے باوجود یہ لوگ سوتے کیوں نہیں...؟

دیکھتے نہیں، صبح کے انتظار میں بچے، جوان اور بڈھے کھڑکی کی آہنی سلاخوں کے پاس منہ لے جا کر صبح کے سورج کا منظر دیکھتے ہیں...

... * ...

اور اُس طرف دیکھو سامنے فلیٹ میں بتی جل رہی ہے کھڑکیوں کے شیشوں پر سائے لہرا رہے ہیں... ڈانس کا منظر دیکھو... ہاتھوں میں گلاس بھی ہیں۔

ٹھیک...

لیکن یہ فلیٹ اس شہر والوں کے نہیں ہیں۔

... * ...

یہاں بچے اچانک نیند سے ہڑبڑا کر کیوں اٹھتے ہیں ... ؟ ...
- خوف سے ... ہاں یہ اور بات ہے کہ آنے والی جوانی میں وہ اس طرح نہیں اٹھیں گے۔

... * ...

اس شہر میں کتنی خاموشی ہے ....!
تمہیں نہیں پتہ، یہ ظاہری خاموشی ہے، دو ہفتے پہلے آتے تو یہ بات نہ کرتے۔
کیوں ...؟
مائیں گھر میں بچے کھچے، بیٹوں اور مردوں کو زبردستی نکال رہی تھیں، کل جس گاؤں میں ہم چلے تھے وہاں کے سارے مردوں کو گھروں سے پکڑ کر لے گئے تھے رات کو عورتوں نے روڈ پر آنے والی خاکی گاڑیوں پر حملے کئے تھے۔
بس وقت کی بات ہے یہ لوگ جو باہر سے چپ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اندر طوفان چلتے ہیں ....

... * ...

دھرتی میں گاڑھے ہوئے لوگ۔ نکلنے کی کوشش۔ زبانیں باہر نکلی ہوئیں۔ آدھے سے کٹی ہوئیں سُرخ سُرخ زبانیں۔ آنکھیں انگارے۔ پسینے سے تر، اوپر ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے سانس لینے میں بھی نکلنے کی جستجو، کافی دنوں سے چلچلاتی دھوپ میں میدانوں پر، گاڑھے ہوئے لوگ ... لوہے جلتی ہوئی اور پیٹھ پر چابک۔
لیکن نہ کوئی چیخ نہ پکار...
سندر چہرے۔ سندرتا اور رنگینیاں اٹی ہوئی بستیوں سے، نظریں چراتے ہوئے، ایک دوسرے کو چوری چوری دیکھتے ہوئے، مسکراہٹوں کا تبادلہ...
سیاہ بے ترتیب داڑھیاں، بے ترتیب بالوں میں خون کے سیاہ ہوتے قطرے، سرخ ہونٹ اور ناک سوجے ہوئے آدھے سینے تک زمین میں گڑھے ہوئے جیسے زمین میں بھالے گاڑے ہوئے

درد، اذیت پر بھی کوئی آواز نہیں۔

ملقین ہونے کا احساس جیسے رات کے سینے کو چیرتے ہوئے سورج کے نکل آنے کا۔ دید نکلنے والے دن کے انتظار میں ...

بھیگتی ہوئی مسوں والے نوجوان۔ نیم کے درختوں میں لٹکے ہوئے اوندھے منہ، جسم تڑپتے پیٹ میں بھوک سے، جیسے شیشے کے ٹکڑے آنتوں میں پڑے ہوئے۔ جن میں گھاؤ ... آنتوں میں خون ...

⁂

کمرے میں ٹھونسی ہوئی عورتیں، کنواری اور جوان پورے مہینوں کے پیٹ سے دوڑتی ہوئی، پیٹھ پر لگتے ہوئے چابک ... آنکھوں میں نہ رحم نہ بھیک ....

سوال کرتی ہوئی ... اور دوڑوں .... اور دوڑوں ... بغیر کپڑوں کے۔ خاکی وردی والے کے سامنے ننگے پن کی شرم مردہ ... پر سر اونچا، اچانک ہاتھوں میں جکڑی ہوئی کلائی۔ کھینچا تانی قریب لانے کی کوشش ...

منہ کی طرف زور سے خشک تھوک اوندھے منہ پٹتے ہوئے ... خون آلود جسم، چھاتیوں سے ٹپکا ہوا خون سرد ہوتے ہوئے جسم۔

⁂

اتنے سارے لوگ بندھے ہوئے، پر پہلے ایک ہی کو اذیت کیوں، ایک کے سچ بتانے پر باقیوں کی جانیں بچ سکتی ہیں۔

ہاں .... یہ صحیح ہے ... لیکن کیا تم نے قطار سے بچھڑی ہوئی کونج دیکھی ہے جو اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈتے تھک ہار کر زمین پر گر جاتی ہے اور جان دے دیتی ہے۔

یہ بات بھی ویسی ہی ہے ...

⁂

بادل کتنے ہی گہرے اور سیاہ کیوں نہ ہوں پر سورج کی کرنیں انھیں چیر کر نکل آتی ہیں اسی روشنی میں فصلیں پکتی ہیں۔ اناج پیدا ہوتا ہے اور انسان اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔

⁂

اس لاش کو اتنا سجایا کیوں گیا ہے...؟ ...اور لوگ بجائے رونے کے۔ باتیں کرتے ہوئے خوش خوش کیوں جا رہے ہیں...؟

یہاں اس شہر کی رسم ہے کہ دھرتی کی لڑائی میں مارے ہوئے لوگوں کا جنازہ پھولوں سے لدا ہوا ہوتا ہے اور لوگ خوشی خوشی سے اٹھائے ہوئے مسکراتے چلتے ہیں۔

... ...

اُف... یہ شہر یہ گاؤں ... لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں؟ اس لئے کہ انھیں یہاں ہی رہنا ہے۔ پچھلے سال میں پڑوس والے شہر میں گیا تھا وہاں بھی ایسا ہی اندھیرا تھا... پر آج وہ خوش ہیں سکھی ہیں۔ کتنے پیار بانٹتے ہیں وہ ... ہاں یہ لوگ بھی ویسے ہوں گے۔

انھی کی طرح ... یہ بھی سکھ اور امن پائیں گے۔ اچھا سنو... وہ سامنے کونسا شہر ہے، وہاں کا کیا حال ہے...

وہاں بھی اسی طرح اندھیرا ہے... اچھا ٹھیک ہے... میں پھر چلتا ہوں اُس شہر کو...

تباهی

جان خاصخیلی

رات نے ساری دھرتی پر تباہی مچا دی تھی۔

پیر جیو ہاتھ پاؤں مار مار کر نڈھال ہو گیا تھا۔ نیند کی آغوش میں گم ہو چکا تھا اور ستارے ایسے لگ رہے تھے جیسے بھوکے لوگوں کے بے آرام نین ٹم ٹم کر رہے ہوں۔

لوگ سارا دن کھیتوں اور ناہموار زمین پر چلتے چلتے چارپائیوں کی جھول میں لیٹ گئے تھے اور وقفے وقفے سے کسی مویشی کے گلے میں بندھی ٹلی (گھنٹی) کی آواز رات کے سناٹے کو چونکا دیتی اور اس آواز پر لوگ کروٹ لے کر پھر سو رہے تھے۔

نہ جانے کیوں ایسے لگا تھا کہ آج کی رات ہماری زندگی کا کوئی امتحان ہے۔ کوئی پل صراط گذرنی ہے۔ امن اور محبت پر کوئی ڈاکہ لگنا ہے۔ عجیب پیڑا تھی جس نے اس کے من میں ہلچل مچا دی تھی۔ نیند شاید اس کی آنکھوں میں خونچکاں ہو چکی تھی۔ اور خون کے داغ جذبات کے بہاؤ میں بہتے ہوئے اکر نینوں کی جھیلوں میں جمع ہوئے تھے۔

سارا دن اخباروں کی شہ سرخیاں، ہوٹلوں پر، دوکانوں پر اوطاقوں پر بار بار بیٹھ کر پڑھی تھیں۔ لاش بوڑھوں کے، جوانوں کے، عورتوں کے۔ فوٹوز کے نیچے لکھا تھا "ڈاکو مارے گئے" دوسرے فوٹو میں جلے ہوئے گاؤں کا منظر اور نیچے، "ڈاکوؤں اور پولیس کے درمیان جھڑپ" اس کا جسم جل رہا تھا۔ اسے لگا اسے کسی نے آگ میں جھونک دیا ہے۔

اسے یاد آیا اس دن جب رائفلوں کے فائر کی آواز آئی تھی۔ دو تین فائر ہوئے تھے آوازوں سے جیسے خون سے بھرے گھڑے ٹوٹے تھے جوانیاں ٹامر کی جلن پر تڑپ رہی تھیں۔

کسی کے کندھے سے بازو للک رہا تھا اور کسی کی ٹانگ سے گوشت اڑ گیا تھا۔ وہ آنکھوں دیکھا منظر اس کے نینوں کی اسکرین پر تراشے ہوئے پتھر کی طرح اُگ گیا تھا۔

ایسا منظر جس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ بس تصویر تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے خلاء میں معلق ہو گئی تھی۔ وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ آیا تھا خون کی طرح سرخ پانی وہ سیدھا لیٹا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں۔ آکاش میں کسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ دیکھی بھالی واقعاتی تصاویر کو یا ان مناظر جو ابھی اس کی آنکھوں کے سامنے آئے تھے۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور اُچٹتی سی نظر اپنے ارد گرد ستاروں پر ڈالتے دل ہی دل میں گنگنانے لگا اور آواز ہونٹوں سے پرواز کر کے عجب سرسراہٹ سے خلا میں بھرنے لگی،

سکھ کا سورج طلوع تو ہو گا

آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی

آنسو جن میں اُبل رہے ہیں،

ایسا دن بھی .....

از خود اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا اور پچھتاوے والی کیفیت اس کے چہرے پر رقص کرنے لگی تھی۔ اسی لمحے اپنے آپ سے پوچھا تھا "واقعی ایسا دن آئے گا بھی"؟ جب یہ سوچ رہا تھا تو اسے لگا تھا جیسے جلتی ہوئی حیک ہارڈی ہو، چارپائی پر کروٹ لینے لگا، تڑپ تڑپ کر نڈھال ہو گیا تھا اور پھر خاموشی سے کہکشاؤں میں گھورنے لگا تھا۔

اس نے سوچا کہ میں وہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں جو میرے ارد گرد ہو رہا ہے، معروضی حالات خارجی حالات، داخلی حالات، اس کا گلہ خشک ہو گیا، جیسے شیل کی گیس منہ میں چلی گئی ہو۔ وہ ایک ہی سانس میں دو گلاس پانی کے پی گیا۔

رات کافی گذر چکی تھی اچانک کسی آواز پر خالی پیٹ کے کتے بھونکنے لگ گئے تھے۔ جیسے صدیوں کی خاموشی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اس نے اپنے بڑوں کی زبانی سنا تھا کتے نو وارد کو چال اور سانس کی آواز سے تاڑ لیتے ہیں۔ تھکے ہارے گھر والے اپنے اپنے مویشیوں کو دیکھنے گئے تھے اور پیشاب کے بہانے گھر کے آنگن سے نیچے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان

کر رہے گئے تھے کہ کہیں کوئی چور نہ آیا ہو۔ اسی بہانے سے وہ بھی چارپائی سے نیچے اترا تھا اور تھکاوٹ سے چور جسم سے ٹہلنے لگا تھا۔ اچانک زوردار فائر کی آواز آئی اور پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کے جسم سے تھکاوٹ شکار ہونے والے پرندے کی مانند اڑ گئی تھی۔ لوگوں کی چیخ پکار بچوں کے رونے کی آوازیں چھپ گئی تھی اور وہ اپنی بیوی سمیت گھر میں عجیب قسم کے خوف کے عالم میں چپ چاپ سنتا اور دیکھتا رہا۔

پھر ہلکے سے بندوقوں کے فائر کی آوازیں ان کے کانوں تک آئیں۔ یہ شاید جوابی فائر تھے ان جوابی فائر سے اس نے نفع نقصان کا اندازہ لگا لیا تھا اور خود بھی ہاتھ میں چھری لئے دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں سے لپکے آگ کے شعلے نظر آ رہے تھے۔ وہ بیوی کی طرف گیا۔ جو اسی کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اس کے چہرے میں گھورنے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں کوئی آنسوؤں کی بوند ڈھونڈ رہا ہو، لیکن آنکھیں خشک تھیں شاید۔ بولنا چاہا لیکن دہرا نہیں سکا۔ آنکھیں زور سے بند کر کے پھر کھولیں اس کے چہرے پر بوریت کے سائے لہرانے لگے۔

اس کی بیوی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی اس کے چہرے سے ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے پتہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا اور بار بار ہوگا۔

کچھ لمحوں کے بعد پرندے پو پھٹنے کی بدھائیاں لے کر گھونسلوں سے نکلے تھے۔ دور افق سے سورج جیسے خون میں غوطے لگا کر نکلا تھا۔ اور رات کا سینہ چیر کر کسی اُس کی طرح نمودار ہوا تھا۔

آج کا یہ ڈرا دینے والا ماحول، گرمی، گھٹن، پگھل جائیں گے۔ اسے لگا تھا جیسے بندوقوں کی نالیوں سے نکلتے فائر کی بازگشت اب بھی گونج رہی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو پکارا جو چپ ہی چپ میں جھولے میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ جھولہ جس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ اس نے ایک نگاہ کھڑکی سے آنگن پر لگے پیڑ پر ڈالی۔ جس کی ڈالیاں اور پیلے پتے جیسے کوئی ٹی بی کا مریض ہو۔

اس کی بیوی آئی تھی اور اس کے سرہانے آ کر کھڑی ہو گئی اور وہ تصور میں کوئی خوفناک منظر دیکھ رہا تھا۔

بیوی بولی،

"کیا ہوا۔؟"

اس نے سنا ہی نہیں۔

پھر اس نے اپنا دائیاں ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا، جیسے کسی الاؤ سے کوئی چنگاری اُکر اس کی پیشانی پر گری اور بجھ گئی۔ وہ چونک اٹھا اور اپنی بیوی کو دیکھ کر بولنا چاہ رہا تھا لیکن اسے کوئی نئی بات نہیں سوجھی۔

"تم کتنے بردبار تھے کہ مجھے جدوجہد میں آنے والے نشیب و فراز سے خبردار کرنے کے واسطے کتنا بولتے تھے۔ لیکن آج لگتا ہے کہ تمہاری اتنی ساری جرأت زخمی ہو گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ جدوجہد کرنے والے توپوں اور گولے بارود کو دیکھ کر ڈرتے نہیں ہیں۔ اور تم مجھے ایسے لگتے ہو۔ جیسے انقلاب میں رومانیت پسند چھچھورے لڑکے ہو جائے کی پیالی پر گھٹنوں جھک مارتے ہیں۔"

وہ بولنا چاہتا ہے، مشتعل ہو کر لیکن اس کی زبان سے نکلتے الفاظ جیسے بنگال میں سمندری طوفان میں بہہ جانے والے کھلونے۔

"تم .... تم .... سمجھتی نہیں .... ہماری جدوجہد ....."

"ہاں! ہاں، میں جدوجہد کو سمجھتے ہوئے ہی یہ کہہ رہی ہوں اتنی بڑی واردات سے ساری سماجی زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی تحریک چلنے کے دوران کوئی صحتمند تنظیم بن جاتی ہے جو جدوجہد کو صحیح رُخ پر لے جاتی ہے اور منزل پر پہنچاتی ہے، کچھ اچھے نتائج نکل سکتے ہیں لیکن تمہاری طرح خوف و ہراس میں گھر جانے سے آدمی کسی قابل ہی نہیں رہتا۔"

"تم فضول دلائل دے کر مجھے خواہ مخواہ بزدل ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں۔" وہ غصہ میں انگلیاں مروڑتا باہر نکل گیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے وہ بیروت کی ویران گلیوں سے گزر رہا ہو۔ وہ تیز تیز چلتا اسکول والے میدان میں پہنچا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ اچھے بھلے لوگ بھی گونگوں کی زبان بول رہے تھے۔ وہ بھی آگے بڑھا لوگ فوجی بوٹوں کی طرف اشارے کر رہے تھے۔ اس نے دیکھا جیسے سارے میدان پر مویشی آپس میں لڑ رہے ہوں پھر لوگ جلتے گھروں کی طرف بڑھے تھے وہ ان کے پیچھے گیا تھا۔ مویشیوں کے چھپر اور کچے گھر راکھ بن گئے تھے، جانوروں کے جلنے کی بو نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی ایک بوڑھے کی لاش

یہ لوگ جمع تھے اس نے دیکھا کہ اس کے بیٹے کا پنجرہ جلا ہوا تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے جو بار بار کپڑے کے کونے سے پونچھ رہے تھے۔ وہ ذرا اور آگے بڑھے اسی پڑوس کے گھر میں جس کا شاید ایک ہی دروازہ تھا۔ آنگن میں لوگ جمع تھے، ایک عورت کی لاش پڑی تھی۔ کوئی دوسری عورت کہہ رہی تھی "یہ پورے مہینوں سے تھی جب گولی لگنے کے بعد گر پڑی تو بچے کے جسم کا آدھا حصہ باہر نکل آیا تھا۔ اس بچے کو باہر نکالا۔ وہ کچھ دیر زندہ رہا لیکن پھر مر گیا۔"

"ہاں! شاید بارود کی بو کی وجہ سے" وہاں کسی نے کہا تھا۔

اس ہجوم سے کسی نے پوچھا "گرفتاریاں بھی ہوئیں؟" وہ غصہ میں سرخ ہو گیا تھا اور اس آدمی کی طرف گھور کر کہنے لگا۔ گاؤں کا پورا ایک حصہ جل گیا ہے۔ کتنے ہی مرد اور عورتیں ٹرکوں میں بھر کے لے گئے ہیں سب تجھے یہ بھی پتہ نہیں۔"

وہ شرمندہ ہو گیا تھا۔ چلنے لگا تھا جیسے اس کے پاؤں سو گئے ہوں۔

اچانک اس کے ذہن میں تخریب کاری کے خیالات، شرارتی بچوں کی طرح کھیلنے لگے تھے۔

اتنے سارے انسان دشمن ونرسز بنائے گئے ہیں۔ مختلف وردیوں والے، بغیر وردیوں والے جانوروں کی شکلوں والے۔ سارے بہت ہی خطرناک۔

پھر خیال آیا تھا کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے وہ میری اس سوچ سے کتنا مختلف ہے۔ پھر کیا ہو گا؟ ڈر گیا تھا اس سوال سے۔ بہت بڑا سوال تھا۔ مل کر سوچنے جیسا سوال۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

دن بہت گرم تھا۔ درختوں کے پتے سوکھ گئے تھے۔ اس نے میت اٹھانے والے لوگوں کی طرف دیکھا اور فوجی بوٹوں کے نشانات پر تھوکتا ہوا آگے چلا گیا اور جا کر قافلے سے ملا اور پھر قبرستان سے جلدی واپس آ گیا تھا۔

اس کی بیوی جھونپڑے میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی "کھانا تیار ہے؟" وہ بیوی سے مخاطب ہوا۔

"رات ہی میلے سے بچے ہوئے آٹے سے روٹی پکی تھی" بیوی نے کہا۔

اس نے دیوار اور چھت والے کونے کی طرف دیکھا۔ ایک مکھی مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوئی تھی اور نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔

خود بخود اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔

"سکھ کا سورج طلوع تو ہوگا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی...."

اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتے باہر نکل گیا تھا۔

انشائیہ گوہر سلطانہ عظمیٰ

غلام عورتیں
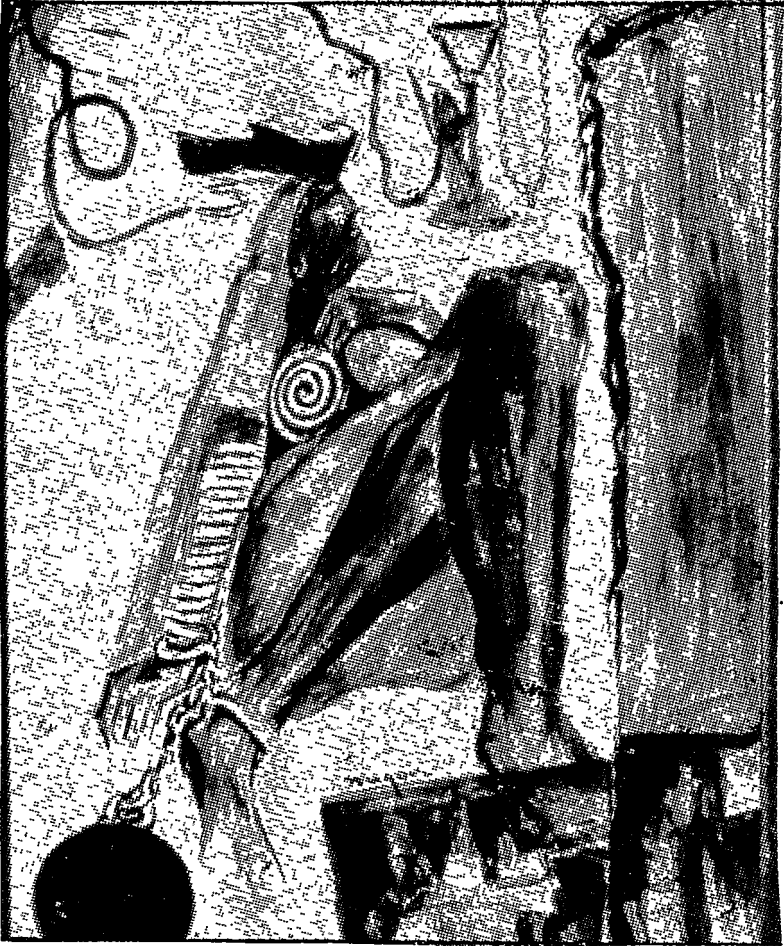
(کتاب چھپائی کے آخری مراحل میں تھی جب یہ کہانی موصول ہوئی موضوع سے ہم آہنگ ہونے کے باعث آخری کاپیاں روک کر اسے کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے ہم مصنفہ سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کی قیمتی کاوش کو کتاب کے آخر میں جگہ دی گئی ہے ۔ مرتبین)

طالب علمی کا دور کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ چیزوں کے اندر عجیب سی پراسراریت سرایت کر جاتی ہے۔ پھر ہماری بیرونی دنیا کی یہ پراسراریت ہماری اندرونی دنیا کا رومانٹزم بن جاتی ہے۔ ممکن ہے آپ کے ساتھ نہ ہوا ہو میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوا۔ مجھے ہر شے اور ہر انسان ایک عجیب سے حصار میں نظر آتا تھا کہ اس حصار کے اندر سے منعکس ہوتی اس کی اصل شخصیت ہر لمحہ رنگ بدلتی لگتی، میری اس کیفیت کا سب سے زیادہ اطلاق عائشہ پر ہوا، ابو کے بائی پاس کے لئے بڑے بھائی نے انہیں انگلینڈ بلا لیا، امی ابو کے ساتھ چلی گئیں اور میں نے اپنی ایڈونچر پسند شخصیت کے باعث بہن کے گھر رہنے کے بجائے یونیورسٹی ہوسٹل میں رہنا پسند کیا جہاں چند ہی دنوں میں میرے لکھنوی انداز گفتگو اور نشست و برخاست کا خوب خوب مذاق اڑایا گیا۔ ان دنوں مجھے پتہ چلا کہ لڑکیاں کتنی بے تکی بھی ہوتی ہیں جبکہ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ امی نے اپنے یوپی کے کلچر کی تمام تر نزاکتیں ہم بہنوں کے مزاج کا حصہ بنا دی تھیں۔ وہ ابتدا ہی سے لڑکیوں کے کھیل کود جیسے مشاغل میں حصہ لینے کے خلاف تھیں۔ لہٰذا ہم بہنیں بڑی نزاکتوں سے پلی تھیں اور اب امی کو مجھے ہاسٹل میں داخل کراتے ہوئے بے حد پریشانی تھی مگر تمام تر نزاکتوں کے باوجود میری طبیعت کا ایڈونچر بہر حال اپنی جگہ تھا لہٰذا ہوسٹل لائف کی پراسراریت کا پردہ چاک کرنے کے لئے میں نے ہر حال میں ہوسٹل میں رہنے کو ترجیح دی تھی جہاں چند ہی دنوں میں میری طبیعت اچھی طرح صاف ہو گئی۔ اور جب "فرمائیے" "زحمت نہ کیجئے"، "تشریف رکھیے"، "معاف کیجئے"، جیسے الفاظ میری لغت سے نکل گئے تو میں نے ذرا اطمینان کا سانس لے کر چاروں طرف نظر ڈالی۔

بھانت بھانت کی لڑکیوں میں عائشہ میرے لیے ایک عجیب لڑکی ثابت ہوئی۔ میں سرشام لان سے پھول توڑ کر اپنے کمرے میں رکھنے کی عادی تھی کہ میری دنیا میں عورت اور پھول کی خوشبو ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ دونوں جہاں ہوں وہاں

کی فضا کو اپنے دھیمے دھیمے احساس میں گھیر لیتی ہیں۔ دوسری لڑکیاں میرے طور طریق کا لاکھ مذاق اڑائیں مگر کسی نہ کسی پہلو سے وہ بھی کچھ ایسے ہی انداز کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ البتہ عائشہ کو میں نے مختلف پایا، اس کا سانولا چہرہ کسی اندرونی احساس سے ہمیشہ چمکتا رہتا تھا۔ اس کے قدرے چپٹے بر می نقش ایک ہی ہلکی مسکراہٹ کے زیر اثر نظر آتے، مضبوط جسم اور اچھے قد کی مالک عائشہ ہمیشہ الگ تھلگ نظر آتی تھی۔ میں نے اس کے کمرے کا دروازہ ہمیشہ بند پایا البتہ کبھی وہ تنہا لان کے پودوں کو چھوتی، پھولوں کو سونگھتی کچھ گنگناتی، ٹہلتی نظر آتی اپنے آپ میں مگن! اس کی ہوسٹل کی تمام لڑکیوں سے دوستی تھی سلام دعا تھی مگر ساتھ کسی کا نہ تھا پھر بھی وہ مجھے تنہا ہوتے ہوئے تنہا نہ لگتی جیسے ایک زمانہ اس کے ساتھ ہو! پہلے مڈٹرم تک تو حال اور حالات دونوں خراب تھے مڈٹرم کے ٹسٹ ہوتے ہی تھوڑا سا سکھ کا سانس لیا تو عائشہ سے دوستی کرنے کی خواہش جاگی، مشکل یہ تھی کہ میں پلان بنا کر دوستی کرنے کی قائل نہ تھی۔ بلکہ خود بخود دوستی ہو جانے پر یقین رکھتی تھی اور عائشہ کے معمولات ایسے تھے کہ ان میں میرے لیے تو کیا کسی کے لیے بھی کوئی گنجائش نہ تھی صرف ایک ہی راستہ تھا جو مجھے اس تک لے جا سکتا تھا اور وہ تھی میرے اور اس کے مضامین کی قدرِ مشترک وہ صحافت میں ایم اے فائنل کی اسٹوڈنٹ تھی اور میں آنرز سال دوئم کی۔ اس لیے میں نے اپنے اسائنمنٹ کے لیے کتابیں ڈھونڈنے کے سلسلے میں اس سے مدد کی درخواست کی، جس پر اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا

"دو ایک کتابیں تو تمہیں میرے پاس سے مل جائیں گی" اس نے ایک طرف رکھے کتابوں کے ریک کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دو ایک کتابوں کے لیے کتابوں سے بھرے اس ریک کی طرف دیکھا لیکن اس سے زیادہ دلچسپی کا باعث میرے لیے وہ چند پوسٹر نما تصاویر تھیں۔ جو بڑے اہتمام سے اس نے الماری کے پیٹ اور دیوار پر چسپاں کر رکھی تھیں۔ یہ تصاویر ایسی شخصیات کی تھیں جن کا کیمپس کی موجودہ

سیاسی صورتحال میں نام لینا بھی جرم تھا اور عائشہ نے اپنے کمرے میں ان کی تصویریں پورے اہتمام اور اعتماد کے ساتھ آویزاں کر رکھی تھیں۔

"تمہاری جرأت کی تو داد دینی چاہیئے" میں نے کہا تو وہ مسکراتی رہی "بھئی اپنی اپنی سوچ ہے، اپنی اپنی پسند اور ہم تو پسند چھپانے کے قائل نہیں"

"اور یہ پسند مہنگی پڑ گئی تو؟" میں نے بھی مسکرا کر پوچھا۔

"اچھا ہے ---اور قیمتی ہو جائے گی۔ اس نے خلاف توقع کہا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم پولیٹکس میں بھی دلچسپی رکھتی ہو" میں نے کتابوں کے ریک میں سے ضرورت کی کتابیں ڈھونڈتے ہوئے کہا:

"قطعی نہیں ----" وہ بڑے اعتماد سے بولی " میں سیاست کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہوں ہمارے ہاں تو یوں بھی سیاست ہے ہی نہیں کہ ہم اس سے واقف ہوں ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ اقتدار کی جنگ کیا ہوتی ہے"

"قطعی سیاسی بیان ہے یہ" میں نے کہا تو وہ زور سے ہنسی پھر بولی "میں سچ کہہ رہی ہوں فرح ، میں پولیٹیکل مائنڈڈ ہرگز نہیں ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بہت خودغرض ہوں"

"پھر تو تمہیں سو فیصد پولیٹیکل مائنڈڈ ہونا چاہیئے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم سمجھی نہیں ---- میں دراصل اپنے کیریئر کے معاملے میں بہت خودغرض اور اس کے راستے میں آنے والی بڑی سے بڑی چیز کو قربان کر سکتی ہوں اس لیے سیاست اور سیاسی شعور رکھنے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ تو دراصل بحیثیت شخصیت میری پسند ہیں اس نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی عائشہ کی خودغرضی پہ بلکہ میں تو سرے سے سمجھ ہی نہ سکی کہ اس سے اس کی مراد کیا ہے۔ ممکن ہے وہ کیریئرسٹ ہو اور ایک درمیانی راستے پر چل کر خود کو دونوں انتہاؤں سے بچانا چاہتی ہو۔ میں نے دو ایک بار سوچا پھر ایک روز یہ عقدہ بھی کھل گیا۔ جب مجھے عائشہ کی

ہی زبانی پتہ چلا کہ اس کے والدین کا کافی عرصے پہلے انتقال ہو گیا تھا اب وہ اور اس کا بڑا بھائی تنہا رہتے تھے دونوں ایک دوسرے کے لیے ماں باپ بہن بھائی دوست سبھی کچھ تھے۔ بھائی این ای ڈی میں پڑھتا تھا اور ہوسٹل میں پڑھتا تھا اور عائشہ یونیورسٹی میں۔ شہر میں ان کا ایک مکان تھا دونوں شروع سے ہوسٹل میں رہتے آئے تھے۔ مگر ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔

" والدین کی وفات کے بعد جب میں نے دنیا کو اپنی نظر سے دیکھا تو بقول تمہارے میرے مزاج میں عجیب و غریب عادتیں شامل ہوتی گئیں" وہ مجھے بتا رہی تھی اسی لیے میں اپنے کیریئر کے معاملے میں خود غرض ہوں۔ میں شروع میں ہی یہ بات سیکھ چکی تھی کہ مجھے اپنی صلیب خود اٹھانی ہے" وہ کہہ رہی تھی، " اور ایک بات اور یہ قطعی غلط ہے کہ ہم کسی کے ہونٹوں پر اپنی مسکراہٹ سجا سکتے ہیں یا کسی آنکھ کو اپنے آنسو دے سکتے ہیں۔ میں نے سیکھا ہے کہ ہماری مسکراہٹ بھی اپنی ہی ہوتی ہے اور آنسو بھی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے آنسو تو پونچھ سکتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو مسکراہٹ نہیں دے سکتے، ہمیں بالآخر زندگی سے اپنی خوشیاں خود ہی لینا ہوں گی۔

اب عائشہ کی پراسراریت کے اندر سے اس کی شخصیت کے بہت سے رنگ منعکس ہوتے گئے۔ میں نے اس کے ساتھ چلتے پھرتے گھومتے باتیں کرتے نوٹ کیا کہ وہ بہت مضبوط لڑکی ہے جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔ اسے زیر کرنا آسان نہیں بڑی سے بڑی بات پر بھی میں نے اسے پریشان نہیں پایا۔" ٹھیک ہے دیکھ لیں گے" یہ اس کا خاص جملہ تھا جو سامنے آنے والے کو جو اسے حراساں کرنا چاہتا پسپا کر دیتا۔۔ میں چونکہ ان دنوں بہت آئیڈیلسٹ ہوتی تھی اس لیے عائشہ کا یہ غیر روایتی انداز مجھے بہت عجیب لگتا۔۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس بھی پریشان کرتا کہ میں اس سے مرعوب ہو رہی ہوں ایک روز وہ بہت خوش اور جوش میں بھری ہوئی ہوسٹل میں پہنچی میں اپنے کمرے کے دروازے کے پاس چائے کا مگ لیے بیٹھی تھی۔۔۔ مجھے

دیکھتے ہی اس نے دور سے ہاتھ ہلایا اور پھر میرے قریب آکر بولی ۔۔۔ "مجھے نوکری مل گئی ہے۔"

"ارے کہاں ؟"

"پولیس میں" وہ میرے برابر بیٹھتے ہوئے بولی

"پولیس میں ۔۔۔۔؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا "یہ تمہیں کیا ہوا ؟"

"ہونا کیا تھا بھئی اپنے اخراجات کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی ۔۔۔ اور ہمارے ہاں میرے جیسے طالب علموں کے لیے پارٹ ٹائم جاب کی سہولتیں بہت زیادہ نہیں ہیں اس لیے رشتہ داری کام آگئی ۔۔۔ رشتہ کے ماموں پولیس میں اچھے عہدے پر ہیں ۔ انہوں نے میرے لیے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ مجھے صرف شام کی ڈیوٹی دینا ہو گی۔"

"سنو اصولاً تو نوکری تمہارے بھائی کو کرنی چاہیئے" میں نے کہا۔

"اے تم میرے ساتھ یہ زنانہ قسم کی گفتگو مت کیا کرو ۔۔۔۔۔۔ ! اس نے مجھے گھورکا تو مجھے ہنسی آگئی ۔۔۔۔

ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ انسان بنو" وہ بڑبڑاتی رہی ۔۔۔ یہ باپ بھائیوں اور شوہروں پر تکیہ کرنا چھوڑ دو۔"

"دیکھو بھئی ہمارے تو کوئی ماموں چچا پولیس میں اچھے عہدے پر ہیں نہیں اس لیے ہمیں تو بہر حال ان رشتوں پر تکیہ کرنا پڑے گا" میں نے اسے چھیڑا ۔ وہ بڑے مزے سے نوکری ملنے کی تفصیل بتاتی رہی اور یہ بھی نہ تھا کہ ہوسٹل کی سخت مزاج پرووسٹ عائشہ کے معاملے میں خاصی نرم تھیں ۔ عام طور پر ساڑھے آٹھ بجے کے بعد لڑکیوں کو ہوسٹل سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ اپنے منگیتروں اور فرینڈز کے ساتھ گھومنے کے لیے ہزار جھوٹ بولتیں اور بہانے تراشتیں البتہ عائشہ کو میں نے میڈم سے خود یہ کہتے سنا تھا کہ "میڈم ! جس روز مجھے اپنے کسی دوست کے ساتھ جانا ہو گا میں آپ کو سچ سچ بتا دوں گی اور میڈم مسکراتی رہی تھیں اس روز کے بعد سے وہ رات

کو کھانے کے بعد ہوسٹل پہنچتی ۔۔۔۔ اور بڑے مزے سے اپنی نوکری کے قصے سناتی اس کا تقرر ٹریفک پولیس میں ہوا تھا لڑکیاں اسے چھیڑتیں "عائشہ تمہیں دیکھ کر تو لوگ خود ہی چالان کروا لیتے ہوں گے ؟"

"صحیح بات ہے" وہ مسکرا کر کہتی ۔۔۔۔ "ویسے بڑا مزہ آتا ہے جیپ میں بیٹھ کر شہر کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے اور رعب جھاڑتے ہوئے"

مجھے اس پر رشک سا آتا۔ اور دل چاہتا کاش میں بھی عائشہ کی طرح زندگی گذاروں مگر توبہ جی ۔۔۔۔ امی! اس سے پہلے ہی مجھے گولی مار دیتیں۔ وہ تو میٹرک کے بعد لڑکیوں کی شادی کر دینے کی قائل تھیں یہ تو ابو کی خواہش تھی کہ ان کے بچے لڑکی لڑکے کے امتیاز کے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں یوں میں بمشکل یونیورسٹی تک پہنچی تھی۔ کہاں یہ ملازمت اور وہ بھی پولیس کی ۔۔۔۔ میری نازک طبع ماں سن کر ہی بے ہوش ہو جاتی ۔۔۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ عائشہ پر میرا رشک روز بروز بڑھتا ہی جارہا تھا ۔۔۔ اس کے اعتماد اور سکون نے میرا رہا سہا اعتماد بھی چھین لیا تھا میں سوچتی لڑکیاں ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔ یہاں تو کم بخت پوری زندگی میں صرف ایک بار اسکول میں بیس بال کا بلا اٹھا کر شاٹ مارا تھا اور پھر پتہ چلا کہ جیسے بازو جڑ سے اکھڑ گیا ہو اس روز کے بعد امی نے رو رو کر اپنی جان کی قسمیں دیں کہ خبردار جو کسی کھیل کود، میچ و یچ میں حصہ لیا۔ یہ لڑکیوں کے کام نہیں۔ لاکھ کہا کہ اور لڑکیاں بھی تو لیتی ہی ہیں حصہ مگر امی کی ایک ہی رٹ تھی "توبہ کرو ۔۔ جو کہیں الٹا سیدھا ہاتھ پڑ جاتا تو ۔۔۔۔ لڑکی ذات پرایا دھن ہے اور کچھ کر کے بیٹھ گئیں تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں"

دل تو اس وقت بھی چاہا تھا کہ کہہ دیں "نہ پوچھے بلا سے۔ ہم خود ہی پوچھ پاچھ لیں گے"، مگر امی کے آنسو دیکھ کر ہمت نہیں پڑی تھی ۔۔۔ اب برسوں بعد عائشہ جیسی لڑکی کو دیکھ کر یاد آرہا تھا کہ ہمیں تو امی کی اس روایتی تربیت نے کہیں کا نہ رکھا۔ ایک روز عائشہ تورا فرصت میں تھی اور ہم دونوں چھت پر

بیٹھی دور سنسان کیمپس کو دیکھ رہی تھیں اور ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ جب میں نے اپنا یہ المیہ اسے بتایا کہ کس طرح میرا دل بھی اس کی طرح اب ہواؤں میں اڑنے کو چاہتا ہے وہ میرے سنجیدہ بلکہ رنجیدہ انداز پر خوب ہنسی۔ لیکن چند لمحوں بعد سنجیدہ ہو کر بولی ․․․․ فرح ! یہ صرف تمہارا المیہ ہی نہیں ہے ! نہ یہ بقول تمہارے صرف تمہارے کلچر کا حصّہ ہے دراصل یہ نزاکتیں بلکہ کہنا چاہیئے احتیاطیں ہر اس کلچر کا حصّہ ہیں جہاں فراغت ہے آسودگی ہے اور فراغت اور آسودگی بھی وہ کہ جس کی بنیادیں بہت سے مظلوموں کے خون پر ہوں۔

"کیا مطلب ؟ میں اس کے دل ہلا دینے والے الفاظ سن کر چونک گئی" ہاں بھئی جب آپ ایک وسیع جاگیر کے مالک ہوں یا ایک بڑے عہدے کی کرسی پر بیٹھے ہوں تو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی اراضی میں آنے والے اور آپ کے ماتحت کام کرنے والے تمام لوگ آپ کی ذاتی ملکیت ہیں، ذاتی ملکیت بھی اس طرح کہ ان کے انسان ہونے کی حیثیت کو بھی نظر انداز کر دیا جائے۔ وہ محض "شے" بن کر رہ جائیں ہاں پھر ایسی ہی تن آسانی پیدا ہو جاتی ہے" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"نہیں بھئی ایسا تو کچھ نہیں ہے" میں نے اس کی بات کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا "اور میری کہاں زمین ہے اور کون سا عہدہ ہے میرے پاس ؟" میں تقریباً برا مان گئی۔

"بے وقوف تو خیر آپ ہیں ہی" وہ اطمینان سے بولی "ارے بھئی میرا اشارہ تمہاری طرف کب ہے یہ تو دراصل پورے ایک سسٹم کی بات ہے اور ہم اور تم دونوں اس سسٹم کا حصّہ ہیں۔ ہم دراصل غیر ارادی طور پر ایسے کام کرتے ہیں جو اس نظام کے حق میں چلے جاتے ہیں ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے فرح کہ تم جو کچھ مذاق میں کہہ رہی ہو وہ ایک سنگین حقیقت ہے میں نے کہا نا کہ یہ صرف تمہارے کلچر کا حصّہ نہیں میرے کلچر میں بھی ایسی لڑکیاں موجود ہیں جو زندگی کو اپنی ماؤں کی دی ہوئی خالص نسوانی نظر سے دیکھتی ہیں اور ان کی ماؤں

کو یہ سلسلہ ورثے میں ملا ہے جس کی اصل وجہ ابھی میں نے تمہیں بتائی ہے کہ یہ کلچر ذاتی ملکیت کے تصور سے عبارت ہے"، اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"تم نے صحافت کے بجائے فلسفہ کیوں نہیں لیا؟" اب کے میں نے بھی سنجیدگی سے کہا اور عائشہ نے بلند قہقہہ لگایا "تم ان سچائیوں کو فلسفہ سمجھنا چھوڑ دو۔ تو یقیناً میری طرح آزاد فضاؤں میں اڑ سکو گی۔ دراصل آزادی کی ابتدا ذہن سے ہوتی ہے۔ جب انسان کا ذہن آزادی سے سوچتا، فیصلہ کرتا اور پھر سوال کرتا ہے وہیں سے زنجیریں ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔"

اس روز میں عائشہ کے ساتھ چھت سے نیچے اتری تو پتہ نہیں کیوں محسوس ہوا جیسے پیر پہلی بار زمین میں لگے ہوں۔ ایسا لگتا رہا ہے کہ اب تک میں زمین سے اوپر اوپر کسی غبار میں چلتی رہی ہوں اور اس دھند میں بہت سی چیزیں دیکھنے سے قاصر رہی ہوں۔ سیڑھیوں سے اپنے کمرے تک آتے ہوئے لمبی راہداری سے گزرتے ہوئے میرا دل یکایک گہری اداسی میں ڈوب گیا۔ میں نے درختوں سے پرے دیکھا اوپر آسمان سے اندھیرا جھانک رہا تھا نیچے درخت اور پودے یوں ساکن تھے جیسے کسی سے اپنی فردِ جرم سن رہے ہوں۔ کائنات کی ہر شے عجیب مجرمانہ انداز میں خاموش تھی۔ میں نے غور کیا تو مجھے لگا دراصل یہ میرے دل کی کیفیت تھی میرے قدموں سے لپٹا وہ غبار اب میرے دل کے آس پاس جمع ہو رہا تھا۔ میرا دل کسی جرم کے احساس سے بیٹھ رہا تھا۔ میں خاموشی سے چلتی اپنے کمرے میں آگئی اور اس روز اچانک مجھے اپنا گھر اور امی ابو بے حد یاد آئے اور پھر جانے میں کتنی دیر پڑھنے کی میز پر سر ٹکائے روتی رہی۔۔۔

پھر یوں ہوا جیسے تیز جھونکوں سے خشک پتے بکھر جاتے ہیں ایسے ہی وقت کے تھپیڑوں نے ان سب سے دنوں کو بکھیر سا دیا اچانک ہی دوسرے سمسٹر کے آغاز کے ساتھ امی ابو واپس آگئے اور میں جو یہ تہیہ کئے بیٹھی تھی کہ اب یہ سمسٹر ختم کر کے ہی گھر جاؤں گی اس صبح ناشتے کے لیے میس جاتے ہوئے اچانک میری دنیا بدل گئی۔ جب وارڈن نے مجھے روک لیا اور اپنے کمرے میں بلا کر میرا ناشتہ بھی منگوا

لیا۔میں وارڈن کے اس طرح اچانک مہربان ہونے پر حیران بھی تھی اور پریشان بھی
میڈم نے بڑی رسانیت سے مجھے ناشتہ کرایا میں عجیب گوگو کی حالت میں تھی کہ
یہ ماجرا کیا ہے۔تب انہوں نے سارے برتن اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے شفقت سے
میرے سر پر ہاتھ پھیرا دو تین منٹ انہوں نے ادھر ادھر کی تمہید باندھنے کے بعد
بتایا کہ میں گھر جانے کی تیاری کروں کیونکہ میرے والد کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی
ہے۔

میرے پیٹ میں اچانک بڑے زور سے درد اٹھا۔میں تیزی سے اٹھ کر واش
بیسن تک گئی۔۔۔چند منٹ پہلے کا سب کچھ الٹی کی صورت میں باہر آگیا۔۔۔۔ میڈم
میری پیٹھ سہلاتی مجھے کرسی تک لائیں۔۔۔"حوصلہ، فرح یہ کیا بے وقوفی ہے۔۔۔"
انہوں نے سمجھایا۔۔ میں نے خود کو سنبھالا اور گھر چلی آئی۔۔۔ ابو نے پتہ نہیں دل میں
کیا سوچا صرف تین دن بعد ہی کارڈیو ویسکولر میں ہم سب کے اترے ہوئے چہروں
کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں موندلیں۔۔۔۔۔ ابو چچا انگلینڈ سے بائی پاس کروا کر آئے
تھے آنے کے صرف بیس روز بعد سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا زندگی پر سے جیسے اعتبار
اٹھ گیا۔پتہ نہیں کتنے دنوں تک میں اس بے اعتباری کا شکار رہی، راتوں کو اٹھ اٹھ
کر امی کے جسم پر سانسوں کی آمدورفت کو محسوس کرتی کہ کہیں وہ بھی تو ابو کی طرح
دھوکہ نہیں کر گئیں۔۔۔ابو نے میرے حساب سے دھوکہ ہی کیا تھا۔کتنا کہتے تھے
کہ مجھے سی ایس ایس کرائیں گے بلکہ خود تیاری کروائیں گے اب آنرز کے دوسرے سال
کی ابتدا تھی اور وہ میرے ساتھ دھوکہ کر گئے۔میں نے اچانک پڑھائی چھوڑ دینے کا
فیصلہ کیا امی تو ایسی گم صم ہو گئی تھیں کہ انہوں نے مجھ سے اس فیصلے پر کوئی سوال
جواب نہ کیا۔ابو کے ساتھ ہی مجھ سے پچھلے زمانوں کے سارے رشتے بچھڑ گئے
میرا دل غم آشنا نہیں تھا اس لیے اپنوں سے بچھڑنے کا یہ پہلا درد بہت جان لیوا
لگ رہا تھا۔
میں نے یونیورسٹی ایسی چھوڑی کہ پھر پلٹ کر گئی ہی نہیں۔بعد میں بہت سوچا

ابّو کے انتقال کا پڑھائی سے کیا تعلق تھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ امی کو پہلی بار زندگی میں اپنے طور پر فیصلہ کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے سب سے پہلے میری شادی کا فیصلہ کیا۔ میں روز بروز زندگی کی نئی جہتوں سے پریشان تھی۔ امی کا یہ پہلا خود مختار فیصلہ میری زندگی کو ایک ایسے دھارے پر لے آیا جس میں ایک سی روانی تھی۔ علی نے مجھے محبتوں پر اعتبار کرنا سکھایا میں اپنے سارے بوجھ ان کے کندھے پر رکھ کر اس ایک دھارے کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی ہو کر بہتی رہی اور شاید مجھے برسوں ہوش نہ آتا کہ میں کتنی آگے بڑھ چکی ہوں اور تین مسکراتے خوبصورت پھول میری جھولی کو مہکا رہے ہیں۔ اگر اس روز میرا سامنا اچانک عائشہ سے نہ ہو جاتا۔ میں اپنے ڈرائیونگ لائسنس کے لیے پولیس ہیڈکوارٹر گئی تھی مین گیٹ سے نکلتے نکلتے میری نظر یونیفارم میں ملبوس ایک لیڈی پولیس انسپکٹر پر پڑی میں ٹھٹھک کر رہ گئی " ..... عائشہ عرفان " میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔

وہ میری طرف متوجہ نہیں تھی اور سامنے سے گذرنے والے پولیس آفیسر کو ہاتھ سے وش کر رہی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچی۔

"تم عائشہ ہو نا!" میں نے پوچھا..... وہ میری طرف متوجہ ہوئی پھر اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک لہرائی۔ .... فرح ...." اس نے بے اختیار میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"شکر ہے تم نے پہچان لیا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تم کہہ رہی ہو" وہ میرا ہاتھ گرم جوشی سے دبا کر بولی۔ "یونیورسٹی اور ہاسٹل چھوڑ کر ایسی بھاگیں کہ پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ ہم میں سے کسی کے پاس تمہارا ایڈریس نہیں تھا یقین کرو ڈھونڈ ڈھونڈ کر روہانسے ہو گئے ہم لوگ ...." وہ کہہ رہی تھی اور میں چونک کر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ... یہ لہجہ عائشہ کا تو نہیں

تھا: "کہاں ہو آجکل تم؟" وہ پوچھنے لگی "یہیں ہوں اسی شہر میں" میں نے جواب دیا یہ شہر تو انسانوں کا ایسا سیلاب ہے کہ جو ایک بار گم ہو گیا پھر نہ ملا" وہ بولی تو مجھے خدا جانے کیوں الجھن سی ہونے لگی کوئی کمی کوئی خلا سا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لگ رہا تھا کہ عائشہ بدل گئی ہے۔ میں نے اسے گھر کا پتہ دیا اور آنے کی پُرزور تاکید کی ۔ ۔ ۔ اس روز مجھے لگا کہ میں علی کی دی ہوئی زندگی کے سیکنڈ معاملے کے ساتھ بہتی ہوئی کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہوں وقت کتنا آگے بڑھ آیا ہے میں نے اپنے گھر کے لان میں عین وسط میں کھڑے ہو کر سوچا۔ عائشہ پولیس کے ایک میگزین کی ایڈیٹر ہو گئی تھی اور اس کے پاس کتنا کچھ ہے اپنے بارے میں بتانے اور کہنے کو لیکن میرے پاس ۔ ۔ ۔ ؟" میں نے سوچا ۔ ۔ ۔ میرے پاس کیا ہے علی کی دی ہوئی زندگی ان کا بخشا ہوا یہ سائبان، ان کے عہدے کے سہارے کھڑا اسٹیٹس اور میرے وجود کے یہ تین حصے جنہیں قانون نے باپ کا نام دیا ہے میں اپنی ذات کے حوالے سے عائشہ کو کیا بتاؤں گی کہ اس آگے بڑھتے ہوئے وقت نے میری شخصیت کو کیا نئے رنگ نئی جہتیں دیں ۔ ۔ ۔ عائشہ کے مقابلے میں میرا ازلی احساس کمتری پھر عود کر آیا تھا اور اس وقت پوری شدت سے سامنے آیا جب عائشہ میرے شاندار ڈرائنگ روم میں قیمتی قالین پر بے تکلفی سے بیٹھی میری شادی کی تصویریں دیکھ رہی تھی اور میرے چوتھی دفعہ پوچھے جانے والے اس سوال کو کہ اس نے شادی کیوں نہیں کی؟ پہلے سے کہیں بلند قہقہے سے ٹال چکی تھی میں نے اس کے چیختے برمی نقوش والے دلکش نمکین چہرے کو رشک سے دیکھا پھر اس رات دیر تک سوچا آخر کیا کمی ہے مجھے! میری جیسی زندگی گزارنے کی لڑکیاں دعائیں مانگتی ہیں پھر بھی مجھے گھٹن کیوں ہوتی ہے اس سارے معاملے سے! مگر ہمیشہ کی طرح ایک چپ سی میرے اندر دور تک پھیلی ہوئی تھی اس دفعہ میں ان گرم دوپہروں کو خلافِ عادت جلد تھک جاتی تھی اے سی سے ٹھنڈے کمرے میں کسی رسالے سے دل بہلاتے یا چہرے پر ماسک لگائے لیٹی رہتی۔ ایک دوپہر اچانک ہی عائشہ کے آنے کی اطلاع ملی میں نے اسے بیڈ روم میں بلوا لیا وہ دھم سے میرے قریب بیٹھتے ہی بولی ۔ ۔ ۔ "میں نے نوکری چھوڑ دی" اس نے بالکل اسی انداز میں کہا جس انداز میں دس سال پہلے ہوسٹل میں مجھے نوکری ملنے کی خبر سنائی تھی۔

"ارے کیوں بھئی"؟ میں تیزی سے بستر سے اٹھی تو چہرے پر لگے کھیرے کے قتلے میری گود میں آگرے

"معاملات بہت بگڑ گئے تھے اگر میں خود نہ چھوڑتی تو دو چار ہفتوں میں نکال دی جاتی وہ اطمینان سے بستر دراز ہوتے ہوئے بولی۔

"آخر ہوا کیا؟" میں نے کھیرے کے ٹکڑے پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پریشانی سے پوچھا وہ میری پریشانی پر مسکرائی "تمہاری جیسی نازک طبع لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے کسی شاندار گھر کے عالیشان بیڈروم میں نیم دراز چہرے پر بیوٹی ماسک لگائے دوپہریں گذار دیتی ہو" وہ مسکرائی۔ "اور تم بیچاریوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ دراصل تم اپنے چہروں پر ماسک اور شخصیت پر خول چڑھائے عمر گزار دیتی ہو"

"اور تم جیسی فلسفیانہ مزاج رکھنے والی بے وقوف لڑکیوں کا انجام سب سے برا ہوتا ہے" میں نے جل کر کہا۔

"فضول باتیں کئے جانا اصل بات مت بتانا اس نے میری بات پر حسب عادت قہقہہ لگایا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی "پتہ ہے جیل میں عورتوں کے ساتھ کتنا برا سلوک ہوتا ہے؟"

"جیل میں کس کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا ہے؟" میں نے برجستہ کہا

"اوہ! فرح تم نہیں سمجھو گی" وہ یکایک افسردہ ہو گئی "جن عورتوں سے میں ملی ہوں ان کے بارے میں تم اندازہ تک نہیں لگا سکتیں تم نے دبیز قالینوں سے پرے کھردری زمین پر ننگے پاؤں چلنا نہیں سیکھا زندگی یوں ہر ایک پر مہربان نہیں ہوتی"

"یہ راستہ ان کا اپنا چنا ہوا ہو گا زندگی کو کیوں الزام دیتی ہو ممکن ہے یہ ان کا پہلا انتخاب ہو" میں نے کہا

"یہ بات تم نے سچ کہی یہ ان کا پہلا انتخاب ہے 'ان کا بھی' میرا بھی" اس کا لہجہ دھیما ہو گیا میں پھر پریشان ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔ "عائشہ تم ... بھلا تمہارا ان عورتوں سے کیا تعلق کیا مقابلہ ...؟ میری بات پر عائشہ کے جیسے ہونٹوں سے الفاظ نہیں جیسے انگارے نکل رہے ہوں۔ یہ وہ حقیقتیں اور سچائیاں تھیں جن کا میرے ادراک کی حدوں سے دور تک بھی کہیں ذکر نہ تھا۔ ... ہندوستان کے ایک پنجابی شاعر نے اپنی ایک نظم میں سوال کیا تھا کہ شاعروں کے قول کے مطابق اگر عورت پھول ہے تو کوڑا اٹھاتی جمعدارن سے لے کر کوئلہ چنتی مدراسن تک پھولوں کی کتنی قسمیں ہیں۔

عائشہ کہہ رہی تھی: "مجھے اپنے میگزین کے کام سے جیل کا دورہ کرنا پڑتا تھا مجھے نہیں پتہ تھا یہ دراصل میرے لیے زندگی کے سچ کا راستہ ہو گا اور شاید میں عورتوں کے حوالے سے محض اتنا ہی سوچتی رہ جاتی کہ قتل اور دوسرے جرائم کا ارتکاب کر کے جیل میں آنے والی عورتوں نے اپنے پہلے جرم یعنی عورت ہونے کو کافی نہ سمجھتے ہوئے مرد کی بنائی ہوئی حدوں سے تجاوز کیا اور مزید جرائم کی مرتکب ہوئیں اگر حیدرآباد کے ایک کالج کی طالبہ کی گرفتاری اور جیل آنے کے بعد کی صورتحال نے میرے خیالات میں انقلاب برپا نہ کر دیا ہوتا ایسا انقلاب جس کا پہلا نشانہ میری نوکری بنی صورتحال یہ ہے کہ اب میں مزید اس نظام کا حصہ بن کر کام نہیں کر سکتی ہوں اس لیے ...؟"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میری بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کہوں پھر چند لمحے گذرنے کے بعد
میں صرف اتنا کہہ سکی ۔" اس میں تمہارے لیے کتنا خطرہ ہے تم نے یہ سوچا ہے ؟"
"میرے لیے عورت بن کر جنم لینے میں جو خطرہ تھا جب میں نے اس کی پرواہ نہیں کی تو پھر یہاں تو ایک بڑا مقصد ہے"
وہ اچانک ہنس کر بولی ۔ اس رات میں نے محسوس کیا جیسے میرے چاروں طرف زنجیریں چھنک رہی ہیں اور
کوئی گھیرا سا ہے جو تنگ ہوتا جا رہا ہے ۔ شاید یہ عائشہ کی حفاظت کا خوف ہے جو اس وہم میں ڈھل گیا ہے میں نے
خود کو بہت تھپکیاں دیں مگر میں اس کی طرف سے بدستور پریشان تھی ۔۔۔ ہوا یہ تھا کہ اس روز کے بعد سے
وہ بالکل ہی غائب ہو گئی تھی اور مجھے بیس پچیس دن سے اسکی کوئی خبر نہیں ملی تھی پھر ایک روز اخبار کے
ایک کونے میں چھپی تصویر اور خبر دیکھ کر میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے عائشہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا یہ سب میرے
لیے غیر متوقع نہیں تھا میں جانتی تھی کہ ایک روز یہ سب ہوگا لیکن اخبار میں چھپی خبر نے مجھے چکرا کر رکھ دیا
خبر کے مطابق عائشہ نے اپنے کسی آشنا کی مدد سے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا اس کا آشنا غائب ہو گیا تھا اور وہ گرفتار
ہو گئی تھی ۔ سوال یہ تھا کہ یہ اچانک عائشہ کا شوہر اور دوسرے لوازمات کہاں سے آ گئے تھے ۔۔۔۔؟
میں جب کئی گھنٹے پریشان ہو چکی تو پہلی بار زندگی میں خود کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کی اور ڈرائیور کو ساتھ لے کر
جیل جانے کا فیصلہ کیا ۔ ڈرائیور نے جب علی کا کارڈ اندر پہنچایا تو سپرنٹنڈنٹ خود باہر آ گیا ۔
"بیگم صاحبہ تکلیف کرنے کی وجہ ؟ فون کر لیا ہوتا" وہ ادب سے بولا ۔ میں نے اسے عائشہ کے بارے میں
بتایا تو اس کا چہرہ ذرا دیر کو پھیکا پڑ گیا مگر پھر اس نے ایک علیحدہ کمرے میں میری اور عائشہ کی ملاقات کا بندوبست
کر دیا ۔ بارہ اور موروم میں عورتوں کے جلوس پر لاٹھی چارج ہوا تھا جس میں عورتیں اور بچے زخمی ہوئے تھے
عائشہ اتفاق سے حیدر آباد گئی ہوئی تھی اس خبر کے فوراً بعد اس نے فوری طور پر گرفتاری پیش کر دی تھی اور اخبار
میں خبر آئی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو اپنے آشنا کی مدد سے قتل کر دیا ہے اب وہ بالکل نارمل سی میرے سامنے بیٹھی
کہہ رہی تھی :"ابھی میں نے اپنے ظالم شوہر کو قتل نہیں کیا ہے دراصل میں قتل کرنا چاہتی ہوں اور ظاہر ہے کہ میرا مقصد
ہی میرا آشنا ہے ۔" مجھے اس پر بہت غصہ آ رہا تھا اس کی خود اعتمادی اب جیالے پن میں تبدیل ہو چکی تھی اس
نے مسکرا کر کہا "مجھے حیدر چوک سے گرفتاری دینی تھی لیکن اس کے بجائے میں نے سیشن کورٹ سے گرفتاری دی
کیونکہ حیدر چوک میں بہت فورس تھی اور میں فوراً اور خاموشی سے گرفتار ہو جاتی میں نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا
جہاں سے میرا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے پھر وہاں بھی میں نے مطالبہ کیا کہ مجھے مرد پولیس گرفتار نہ کرے
بلکہ میں زنانہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونا چاہتی ہوں ۔"

"کیا لیڈی پولیس زیادہ مہربان ہوتی ہے ۔۔۔؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اس نے میرے لہجے کو نظرانداز کردیا۔ "لیڈی پولیس کے آنے میں وقت لگتا ہے اور مجھے وہاں موجود لوگوں تک اپنی بات پہنچانے کا موقع مل جاتا۔" چنانچہ میں نے انہیں بتایا کہ میں کیوں گرفتاری دے رہی ہوں پھر جب پولیس نے مجھے تحویل میں لے لیا تو ڈی ایس پی نے معلوم کرنا چاہا کہ کون کونسی عورتیں مزید گرفتاری پیش کرنا چاہتی ہیں میں نے کہا کہ میں تو صرف ایک نام جانتی ہوں وہ ہے قوم ۔۔۔۔ کر سکتے ہو تو پوری قوم کو گرفتار کرلو۔۔۔ عائشہ نے بڑے اطمینان سے کہا اس کی بات سن کر میں نے سر پکڑ لیا ۔۔" میں تمہاری ضمانت کرانا چاہتی ہوں"

"نہیں ہوسکتی" اس نے فوراً کہا اور نہ میں چاہوں گی۔ ویسے بھی تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ تمہارے میاں کا عہدہ خاصہ نازک ہے کیوں ان غریب کو مشکل میں ڈالتی ہو" پھر میری تمام تر کوششوں کے باوجود عائشہ کو چھ ماہ سے پہلے جیل سے نجات نہیں ملی میں نے علی سے حتی الامکان اس معاملے کو چھپانے کی کوشش کی لیکن انہیں علم ہو ہی گیا وہ خاصے بگڑے ہوئے میرے پاس آئے۔

"تم کم از کم میرے علم میں تو لے آتیں تاکہ سوال جواب کی صورت میں میں اپنا دفاع کر لیتا۔"

"آپ جانتے ہیں اس معاملے میں آپ کا تعلق نہیں ہے" میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہی تو مجھے ثابت کرنے میں آسانی ہوتی" وہ بولے۔ "گویا ابھی تک آپ کی وفاداری مشکوک ہے"

"فرح" انہوں نے ذرا سخت لہجے میں کہا "سوچ سمجھ کر بات کرو، جانتی ہو میں کس جگہ بیٹھا ہوں"

"جانتی ہوں، شاید آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم کس جگہ بیٹھے ہیں میرے منہ سے بے اختیار نکلا تو ان کا چہرہ سرخ ہوگیا" مجھے اندازہ نہیں تھا کہ عائشہ کی دوستی تمہارے خیالات کو اتنا بگاڑ دے گی"

" ان کی بات پر میں ذرا کی ذرا سہم گئی۔ میں نے کب زندگی میں ایسی ہمت کی تھی جو کچھ کہہ لیا تھا وہی میری پوری عمر کے لیے کافی تھا پھر عائشہ کا فون آیا اس نے مجھے سختی سے جیل آنے کو منع کیا تھا۔ میں نے علی کے عہدے کا سہارا لے کر اس کے لیے بی کلاس کی کوشش کی تھی جو اس نے خود ٹھکرا دی تھی اب وہ مجھے بہت کمزور اور زرد لگی اس کی آنکھوں کی چمک معدوم تھی اور بال روکھے اور بے رونق ہوگئے تھے۔

"تم میری بات مان لیتی تو کیا حرج تھا۔ میں نے افسوس سے کہا۔

" تم وہاں موجود دوسری عورتوں کی حالت دیکھ لیتی تو صرف میرے لیے ہی یہ بندوبست نہ کرتیں" وہ بولی

"میں اندازہ کر سکتی ہوں لیکن تمہاری دوست ہوں اور تمہیں اس تکلیف میں دیکھ کر خود سکون سے نہیں بیٹھ سکتی تھی" میں نے قائل کرنا چاہا

"تم وہاں موجود بنگالی عورتیں اور ان کے بچے دیکھ لیتیں تو تمہیں لگتا کہ جیسے زین العابدین کے شاہکار سانس لینے لگے ہیں ان کے لباس اتنے تار تار تھے کہ انہیں بے لباس کہنا بہتر ہوگا ان کے جسم پر ہڈیاں یوں

نمایاں تھیں کہ مجھے تو وہ زندہ انسانوں کی بجائے میڈیکل کالج کے ڈاسیکشن روم میں رکھیں لاشیں لگتی تھیں ان کے ساتھ جو بد سلوکی روا رکھی جاتی تھی تم اس کا تصور نہیں کر سکتیں جب میں ان کی کھولی میں گئی تو انہوں نے مجھے گھیر لیا تھا وہ سب روٹی اور رہائی چاہتی تھیں اور سب بنگلہ دیش کی اذیت ناک بھوک سے گھبرا کر بھاگی تھیں لیکن یہاں آکر روٹی کے ساتھ عزت اور آزادی سے بھی محروم ہو گئیں عائشہ جیسے بولتے بولتے تھک گئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا ہم کب آزاد ہوں گی تو میں نے جواب دیا تھا جب ظلم کا راج ختم ہو گا تب ہم سب آزاد ہو جائیں گے" عائشہ کی بات پر میں نے سہم کر چاروں طرف دیکھا وہ بتاتی رہی۔ جیل میں بہت سی عورتیں صرف اس لیے اپنی ضمانتیں رد کروا دیتی ہیں کہ ان کی ضمانتیں کرانے والے بھی وہی تھے جن سے تنگ آکر وہ یہاں پہنچی تھیں۔ میرے سامنے ایک طوائف آئی تھی تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ اسے کتنی سہولتیں میسر تھیں۔۔۔۔ عائشہ نے رک کر پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ وہ گلاس رکھ کر مسکرائی۔۔۔۔

"سوچ تو پہلے لیا تھا اب تو اس سوچ پر عمل کر رہی ہوں۔۔۔۔ ایک روز یہ زنجیریں کاغذ کے ٹکڑوں کی مانند پرزے پرزے ہو جائیں گی فرح اس خوشی کے مقابلے میں یہ سعوبتیں کچھ نہیں" اس نے بڑے عزم سے کہا پھر میری طرف دیکھتی ہوئی بولی "مگر مجھے حیرت ہے کہ تم میری باتیں اتنے شوق سے سنتی ہو اور سمجھتی ہو جبکہ یہ سب دیکھا جائے تو تمہارے خلاف بھی جاتا ہے"

"یہ سب میرے خلاف نہیں جاتا۔" میں نے عائشہ سے صرف اتنا کہا میں اس سے صرف اتنا ہی کہنے کی ہمت کر سکتی تھی جو اس سے ہمیشہ مرعوب رہتی تھی اس سے زیادہ اسے بتا نہیں سکتی پھر جب رات علی نے عائشہ کے آنے پر خاصہ ہنگامہ برپا کیا تو اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر میں پہلی بار اس اعتراف ہمت خود اپنے آپ سے کی جو آج تک ایک خاموشی کی مانند میرے اندر پھیلا ہوا تھا زنجیروں کی وہ چھنک اور تنگ حلقے کا دم گھوٹنے والا تصور دراصل اپنی عزیز دوست کی حفاظت کے خیال کا نہیں تھا یہ تو علامت تھی میری قیدی روح کے بار بار آزاد ہونے کی خواہش کی میں عائشہ کو یہ تو کہہ سکتی تھی کہ یہ سب میرے خلاف نہیں جاتا لیکن یہ کہتے کہتے میرے ہونٹ جامد ہو جاتے تھے کہ وہ جن کا تم نے ذکر کیا تھا وہ تو قیدی عورتیں تھیں لیکن میری جیسی عورتیں تو غلام ہوتی ہیں آسائش اور فراغت کے عوض بک جانے والی غلام۔ ہم اس سارے نظام کو قائم رکھنے میں سب سے مضبوط کردار ادا کرتی ہیں اس لیے کہ ہمیں بھی عالیشان گھروں میں نوکروں کی فوج پر اپنا تسلط عزیز ہوتا ہے ہم سپر پاور یعنی اپنے شوہروں کی بخشی ہوئی آسائشوں کے سہارے اپنا اقتدار قائم رکھتی ہیں۔ ہم بیچاری غلام عورتیں۔۔۔۔ کاش عائشہ تم ہماری اس جیل کی صعوبتوں کا اندازہ کر سکتیں۔ کاش!!

شاعری

دوائیاں

شیخ ایاز

(۱)

بولے کوئی نہ
چپ چپ اشک بہاتے ہیں
دولہا! ریت ضرور ملے گا
تم، رسی لٹکانا
بولے کوئی نہ
اس کٹھور رات کے
نینوں کو چمکانا
بولے کوئی
شادی کے اس بلاوے میں
تم شوق سے آنا
بولے کوئی نہ
بینڈ باجے بجنے لگے
براتی آئے بنا
بولے کوئی نہ
چپ چپ اشک بہاتے ہیں

(۲)

خون آلود پیرہن اتار کر
سفید لباس نہ پہناؤ
مجھے رکاب میں پیر ڈالنے دو
گھوڑے کی زین پکڑاؤ
سفید لباس نہ پہناؤ

یہ تباہی کی رات ہے
رُت کی ریت بچھاؤ
سفید لباس نہ پہناؤ
گبھرو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے
کیوں؟ یہ تو بتلاؤ
سفید لباس نہ پہناؤ
بھیا! چوم کر دھرتی کو
خون کا ٹیکہ لگاؤ
سفید لباس نہ پہناؤ
خون آلود پیرہن اتار کر

آٹھ نظمیں

فہمیدہ ریاض

اے دیس مُبارک ہو!

(۱)

اے دیس مبارک ہو
پہچان کی یہ ساعت
جو آئی نہ تھی پہلے

رقصاں ہیں مری گلیاں
گاتے ہیں مرے گاؤں
اک گیت نئی دھن میں
اک گیت بغاوت کا
وہ گیت کہ ہے جس کی گرمائی نہ تھی پہلے

اک گیت، اندھیروں کی جو کوکھ میں پلتا ہے
کیچڑ سے اَٹی گندی گلیوں سے اُبلتا ہے
شریانوں سے رِس رِس کر ڈھلتا ہے پسینہ میں

گھلتا ہے نمک بن کر گندم کے خزینہ میں
یہ گیت بڑا وحشی، آداب سے بیگانہ
ہر محفلِ رنگیں میں گھس آتا ہے دیوانہ
سنتے ہو دھمک اس کی
پھر آنکھ چرانا کیا!
جو تم پہ نہیں سجتا، وہ سوانگ رچانا کیا!
چہروں پہ کھنڈی زردی اور دل کی سیاہی کو

بجلی کے چراغوں میں بے سود چھپانا کیا!
جو خوب سمجھتے ہو، وہ راز بتانا کیا.... !
شمشیر برہنہ یوں تھرائی نہ تھی پہلے
قاتل کو بھی سفاکی یوں آئی نہ تھی پہلے
اے دیس مبارک ہو
جس ہاتھ میں خنجر ہے
اس ہاتھ کی کمزوری
ہر وار سے ظاہر ہے۔

خانہ تلاشی

(۲)

کوتوال :-

"دیکھو بی بی، یہ پروانہ خانہ تلاشی کا لایا ہوں
نفری ساتھ ہے! لیکن اس کو گلی میں دور بٹھا آیا ہوں
سوچا، میں خود ہی کافی ہوں
ہے درکار ہمیں اک مضموں
رسوائی سے کیا حاصل ہے خود ہی آپ نکال کے لا دیں
ورنہ گھر میں کہاں چھپا ہے؟ سیدھی طرح ہمیں دکھلا دیں"

اپنے گھر کو اس طرح پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
دل دھڑکتا سن رہی ہوں میں درو دیوار میں
سنگ و آہن کی وریدوں سے ٹپکتا ہے لہو
گرم سانسیں، جاگتی آنکھیں، کھلے لب چار سو
مجھ سے سرگوشی میں پھر اک بار دوہراتے ہوئے
سات جنموں کا بندھا پیماں وطن کی خاک سے
چار دیواریں مری دھرتی تری آغوش میں
عافیت کی چار گھڑیاں مجھ پہ تیرا قرض ہیں
کتنے تہہ خانے ابھر آئے نظر کے سامنے

کتنے امکاں ہیں کہ جن کے آج مجھ پر در کھلے
کھل گئی قدموں تلے میری مرادوں کی سرنگ
جس کی دیواروں پہ روشن زندگی کے سات رنگ

اب فصیلِ شہر پہ ہوں گے نئے مضموں رقم
اے گزرتے پل! تری پامال حرمت کی قسم
جس گلی میں میرا گھر ہے، سرخ اس کی دھول ہے
اس دریچے سے پرے لالہ کا کھلتا پھول ہے
اس قدر خطرے کا باعث ایک ماضی کی کتاب!
دیکھ یہ چلمن ہٹا کر میرے مستقبل کا خواب!

لوری

(۳)

(نذیر عباسی کی شہادت پر لکھی گئی)

چاندی کی گھنٹی، کاٹھ کا رہوار
کہاں چلا رے مرے گھوڑے سوار؟
"میں تو چلا میاری بدلی کے پار"
بدلی کے پار لال کہے جگ سارا
گھور اندھیارا
نہیں کوئی تارا
لوٹ آنے والوں کی گھائل پکار
کہاں چلا رے مرے گھوڑے سوار!

نہیں نہیں بدلی کا لال ہے کنارا
کیسا پیارا پیارا
جھوٹا جگ سارا
پل میں پہنچ جاؤں گا میں تاروں کے دوار
میں تو چلا میاری بدلی کے پار

بدلی کی لالی میں جلتا الاؤ ہو جو!
خون بھر اگھاؤ!
لال مت جاؤ!
مینا و شواس دھرے
نینوں میں جھانک مرے
دیکھ آن بان مری دیکھ رفتار

سدا رہے تری آن، مرے آن والے
تری دھنش، ترے بان
پھر سے ہوئے ہیں جوان
جم جم جارے مرے گھوڑے سوار!

جا رے تجھے ہی ملے
روشن تارا
بھورا جیارا
جھوٹا جگ سارا

ایک منظر

(۴۰)

(نذیر عباسی کی شہادت پر مقدمہ)

ایوانِ عدالت میں
پتھرائے ہوئے چہرے
پتھرائی ہوئی آنکھیں
پتھرائے ہوئے لہجے

فریاد کٹہرے میں
بے سود بلکتی ہے
قانون کے رکھوالے
کل لے کے گئے جس کو
اب اس کو یہاں لائیں
وہ نعش تو دکھلائیں

ایوانِ عدالت میں
پتھرائے ہوئے منصف
فریاد سنیں کیونکر
انصاف کریں کیونکر
فنی مجبوری ہے
"درخواست ادھوری ہے"

پتھرائی سماعت میں
بس ریت برستی تھی
ہر آنکھ کہ پتھر تھی
اشکوں کو ترستی تھی

یک دم کوئی دل دھڑکا
شعلہ سا کوئی بھڑکا
پتھر کا چٹخنا تھا
لو پھوٹ بہے دھارے
آوازیں ملیں باہم
اور گونج اُٹھے نعرے
معصوم سی جانوں کے
نوخیز جوانوں کے ۔

کیا گونج لہو کی تھی
کیا شور تھا نعروں میں
ایوانِ عدالت کے
پتھرائے ستوں سارے
دم سادھ کے سنتے تھے ۔

جب سُرخ سلام آیا
مقتول کا نام آیا
گھونسہ سا لگا دل پہ
آنکھوں سے لہو پھوٹا
جیتے رہو دل والو!
پتھر تو کوئی ٹوٹا ۔

مفرور
(۵)

کہیں تو ڈھونڈو سراغ ان کا
کہاں ہے دل اور دماغ ان کا
ابھی تمہارے محاصروں میں گھرا ہے تاراج باغ ان کا

وہیں کسی راہ پر پچھی اُن کی چشم نم ہے
کٹا ہوا ہاتھ آج بھی بستہ قلم ہے
گلوئے زیب رسن سے لپٹی ہیں ان کی باہیں
جو گھر سے نکلے، کہ جیسے دھرتی کے دل سے آہیں

جہاں تھے مسدود سارے رستے
وہیں پہ ان کے قدم گڑے ہیں
تمہارے بوٹوں تلے وہیں ان کے دل پڑے ہیں۔

وطن سے قیدیوں کا عید کارڈ

(۶)

طویل ہے قصۂ ستم گر، طویل تر خلق کی کہانی
جہاں پہ وہ "ختم شد" لکھیں گے وہیں سے کہتے ہیں ہم زبانی

حصارِ زنداں میں حلقہ زن تھی تمام شب سنتری کی حیرت
کہ بند کمروں میں عزم و جرأت در آئے کیونکر بلا اجازت

عجیب و حیران کن ہیں کتنے اذیتوں کے جدید آلے
عجیب تر مشتِ قلبِ انساں کہ جو سنبھالوں پہ سے سنبھالے

کچھ اس قدر سخت جان ہیں، یہ اسیر نسلوں کی کامنائیں
جنم تو لیتی ہیں ساتھ اُن کے پہ اُن کے مٹتے بھی مٹ نہ پائیں

یہ قطرہ قطرہ کسی کے آنسو، یہ ذرّہ ذرّہ کسی کی کاوش
ہلالِ عیدِ سعید تیری بھی کل فزوں تر تو ہو گی تابش؟

اے ارضِ وطن

(۷)

اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن!
کیوں تیرے زخمی تن پہ اُگی
یہ فصل فقط سنگینوں کی
جن کی نوکوں پر جھول رہی
مٹیالے، مکڑی جالوں سی
زور آور جلادوں کی ہنسی

تاریکی تو تخلیق تری
تاریکی میں اسرار بھی ہے
لیکن یہ گھمستا اندھا پن
یہ نابینائی کا موسم
یہ گلو شکستہ محبسِ دم
کیا تو نے اسے بھی خلق کیا؟

مستور ہیں کیوں مہتاب ترے
پھانسی کے سیاہ نقابوں میں
کیوں رونقِ صحنِ مقتل ہیں
غنچے ترے سرخ گلابوں کے
سولی پہ سجائیں کس نے تری
آوازوں کی کچی کلیاں
یہ کن مستوں کے نعرے ہیں
کس لہو کے گاتے دھارے ہیں
اے ربِ دو عالم تو ہی بتا!
جو میرے دیس پہ چھائی ہے
وہ کیا شے ہے، وہ کیا ہے بلا

کیوں میری فضاؤں میں گونجی
نابینائی کی مخش ہنسی
اے ارضِ وطن، اے ارضِ وطن
ارفع ہے مقام شہادت کا
کم سن ہیں ترے نورس نوجواں
نعروں کے کمند بناتے ہیں
اور ان پہ قدم دھرتے دھرتے
یوں رفعتِ دار تک آتے ہیں
یوں موت کے آگے جینے کے
سارے پیماں دہراتے ہیں
(ناتمام)

قتلِ سحر

(۸)

پھر آئی ساعتِ قتلِ سحر

تاریک اُفق کے مقتل میں
پھر داغ لہو کے پھیل گئے
پھر اک بلند منارے سے طولِ شب کا اعلان ہوا
فرمان ہوا
دم بستہ ہے شاخوں میں صبا
سکتے میں شجر
شاخوں پہ سجے مردہ طائر
آنکھوں کے اندھیرے پردوں پر
پھر ایک ہی منظر کھلنے لگا۔
اے جانِ زبوں!
اے دیدۂ تر۔۔۔
یہ قتلِ سحر
کب ٹھہری بات اچنبے کی
اک بار یہ منظر اور سہی
جب جی ٹھہرے، جب جان سنبھلے
ہم پھر یہ نعش اُٹھائیں گے

پھر مردہ سورج کا لاشہ ہم اشکوں سے نہلائیں گے
اس کے نیلے لب چومیں گے، یخ بستہ بدن گرمائیں گے
پھر عرصۂ جاں میں
طفلک نوزائیدہ کو دفنائیں گے

دیوانوں کے خالی کف میں کچھ لعل و جواہر روشن ہیں
کب کوئی لٹیرا چھین سکا اشکوں کا خزینہ خلقت سے
تم اتنا ارزاں مت جانو یہ آنکھوں کا بہتا پانی
ہر اشک مُصر، ہر آہ بضد یہ رات ہمیں منظور نہیں
جب تک قائم ہے اپنا الم، جب تک جلتی ہے اپنا جگر
کتنی بھی بڑھے میعادِ ستم، تابندہ ہے اُمید سحر!

زندگی کے لئے چار نظمیں

احمد سلیم

(۱)

تتلیاں پکڑنے سے، لمحے پکڑنے تک
محبت کی خوں رنگ جدوجہد کتنی معمولی ہے
چاہو تو زمین کے کانٹوں سے پوچھ لو
کہ پیروں سے بہتے لہو کی کہانی تو کوئی خاص نہیں
اور ہاتھوں کی زخمی انگلیوں میں جلتی طلب تو بکھری پڑی ہے،
وقت سے باہر، زندگی کے ہر امکان میں
اور جبر کے ہر فرمان میں

محبت کی کوئی دستاویز نہیں ہوتی
نہ گواہی،
نہ کوئی مجلسِ احتساب
لمحے پکڑنے سے، لمحوں سے بلند ہو جانے کے صبح جیسے وعدے تک
درد کہیں نہیں ہوتا
نہ مسکراہٹ میں،
نہ ہاتھوں میں،

جو محبوب ہاتوں کو چھونے سے پہلے ہی
بس معلق ہو جاتے ہیں برف کی وادی میں
محبت جسم کی طرح فانی ہوتی ہے
اور روح کی طرح امر
لیکن یہ سب کتنا معمولی ہے اور کتنا عام سا

جیسے بھوک سے مر جانا
اور فاقے سے امر ہو جانا
ہماری دنیا میں ایسی ان گنت باتیں ہوتی ہیں
اور انتظار کرتے ہیں لوگ
سماجی انصاف کی لڑائی کے بعد اچھے دنوں کا،
اور دوست کا،
یا شاید خود اپنا
کیونکہ آپ آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں
اور ہاتھوں سے چھونا چاہتے ہیں اسے
جو بستا ہے آپ کے دل میں
لیکن اس کمینی دنیا میں بھی
اخلاقی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے کچلا ہوا

معمولی باتوں کے لئے پریشان ہونا آدمی کی عادت ہے
اسی لئے وہ محبت بھی کرتا ہے
اور لمحے پکڑنے سے، محبوب کی نگاہوں میں سربلند ہونے تک
اپنی میز پر بیٹھا،

مسکراتا ہے ایک بار پھر،
کھلی کھڑکی سے باہر جلتے ہوئے لینڈ اسکیپ پر
وہ اپنے دل کو ہولے سے دباتا ہے
(درد؟ نہیں ایک چھوٹی سی عادت)
ایسا بہت لوگ کرتے ہیں
انتظار جیسے چھوٹے چھوٹے معمولی کام

میرے دل سے خوں کو بہنے دو
زمین پر پھول کھلنے دو
مسکراہٹ کو،
بچوں، تتلیوں اور سارے گھروں تک پھیل جانے دو
محبوب انگلیوں کو،
درد کی، بے دردی کی
انکار کے فرمان جیسی نئی کہانیاں لکھنے دو
ابھی محبت نہیں ہے
قبل از انسان کے دور میں، محبت نہیں ہوتی
ابھی سب کچھ چھوٹا ہے اور معمولی
لیکن طلوع انسان کی نوید، میری زخمی آنکھوں میں لکھ گئی ہیں، دوست
انگلیاں ....

اس لئے میری آنکھوں سے خون بہنے دو
اور مسکرانے دو مجھے
کھلی کھڑکی سے باہر زمین کے جلتے ہوئے لینڈ اسکیپ پر

ابھی محبت نہیں ہے
لیکن محبت کا خواب ہے
ستائے جانے والے انسانوں کی جد وجہد جیسا
خوں رنگ مسکراہٹ جیسا ....

(۲)

جب تمہاری آواز
میرے دل میں گونجتی ہے ٹارچر کمپ میں بھی
درد بھر جاتا ہے ان بے درد لمحوں میں
اور اس سرد مہر خاموشی میں
سنائی دیتی ہے صرف حکمرانوں کے ظلم کی آواز ....
تمہارا دل ایک ٹوٹا ہوا بربط ہے
وہ میری آنکھوں پر گولی چلائیں گے
تاکہ ان میں تمہاری تصویر دم توڑ دے
تاکہ مر جائے صبح کا،
اور انسان کا خواب ....
ان کے پاس طاقت ہے
وہ یہی کریں گے
میری آنکھوں میں گھلتے سیسے سے لے کر
تیری چپ تک
(جو گونج رہی ہے میرے دل میں ٹارچر کمپ کی سرد مہر اداسی میں بھی)
اور ہر طرف بھوک پھیلانے تک
ہر چیز پر ان کا اختیار ہے
لیکن تیرے ہاتوں،

تیری آنکھوں
اور تیرے ہونٹوں سے
میں نے انسان کو
اور راستوں کو پہچانا ہے
اور یہ پہچان،
کبھی نہیں مر سکتی
کسی بھی جبر سے،

ٹارچر کمپ میں بھی،
قیدی اکیلا نہیں ہوتا ......

(۴۳)

ہم بچھڑ گئے، بچھڑنے سے پہلے ہی
اور جیتے رہے،
مرنے سے پہلے ہی،
اس جینے اور مرنے کے بیچ
انسان کی فتح کا خواب تھا بس
ٹارچر کمپ میں، وہ اس پر ٹوٹ پڑے
خواب، لہو لہان مسکراتا رہا .....

(۴۴)

تمہارے نام یہ نظمیں
تمہارے پاس سے گذر جائیں گی
دنیا کے بازاروں میں،
محنت کے تپتے ریگزاروں میں

درد کے تنور میں

جہاں سلاخوں پر بھونے گئے ہات

اور ظلم کے درباروں میں

جہاں کاٹے گئے ہات

لیکن پھر اُگ آتے ہات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دو نظمیں

گوہر سلطانہ عظمیٰ

اونٹنی والے بھلے مسافر!

(۱)

اونٹنی والے بھلے مسافر
رکو فصیلِ شب سے ادھر ہی
یہ وہ شب ہے
جس کی سحر کی قیمت
ان تاروں کا لہو ہے
رن میں گرنے والے
دلداروں کا لہو ہے۔

اونٹنی والے بھلے مسافر!
رکو، فصیلِ شب سے ادھر ہی
یہ شعلے جو دیکھ رہے ہو
گھر گھر ایک ہی آگ لگی ہے
اک اک دل میں
درد کی ایک ہی جوت جگی ہے
یہ شعلے جو دیکھ رہے ہو

جشن نہیں ہے
پھر بھی صبح یہیں کہیں ہے
پھر بھی صبح یہیں کہیں ہے
اونٹنی والے بھلے مسافر!

... آنکھیں بند نہ رکھنا
(۲)

مرتے جسموں، پگلی روحوں پر وہ
جشن منانے آئے ہیں
زہر میں ڈوبے دانت نکالے،
خونی پنجوں، قاتل آنکھوں والے،
اس بستی میں آگ لگانے آئے ہیں

آگ لگا کر، جشن منا کر،
جب یہ اپنے جنگل واپس لوٹیں گے
اندھے ہو جانے کے ڈر سے،
اپنی آنکھیں بند نہ رکھنا،
رات کے اس پل،
جس پل
پورے چاند کو آگ لگے گی
مرتے جسموں، پگلی روحوں سے مل کر تم
شبخوں کی تیاری کرنا،
جنگل میں قاتل تنہا ہوتے ہیں...

وائی

شاہ محمّد پیرزادو

امان! بھیا کو میرے
کون لے گئے ہیں ؟

ریوڑ، چرواہے کے بغیر لوٹتا ہے

پیڑوں نے سائے پھیلائے ہیں
اور جی گھبراتا ہے،

ریوڑ، چرواہے کے بغیر لوٹتا ہے

اُمید آنکھوں میں بھاپ بنی ہے
اور ہونٹ کانپ اُٹھے

ریوڑ، چرواہے کے بغیر لوٹتا ہے

آنکھوں، اور برتنوں کی طرح
ہم خالی پیٹ رہے

ریوڑ، چرواہے کے بغیر لوٹتا ہے

جان سے بھی پیاری دھرتی کو
سب چھوڑ گئے ہیں

ریوڑ، چرواہے کے بغیر لوٹتا ہے

اجنبی اپنے رستے پر جاتا ہے
کس کے پاؤں دکھائی دیئے

ریوڑ، چرواہے کے بغیر لوٹتا ہے

(سندھی سے ترجمہ)

بادلیا بھر کے آؤ

ساغر سیمیجو

بھر کے آؤ
اور خوب برسو۔!
لوٹ لگنے کا
گندم کے دانے کا
گندم کی بالی سے رشتہ ٹوٹا
کسان کے سینے میں
سنگین گھونپ دی گئی
اور دھرتی کی دراڑوں میں
کسی کجلائی آنکھ کا آنسو گرا تھا

ساون رُت میں
پکی فصل میں
گولیوں کی بارش ہوئی تھی
کوئی کوندا سر پر گرا تھا
اور دھرتی کی دراڑوں میں
موتیے جیسی مسکراہٹ اُتری تھی

چودھویں کے چاند کو
بارش کے موسم کو
بم گولوں کی گڑگڑاہٹ میں

نیلے مور کا ناچ اکھڑا تھا
اور دھرتی کی دراڑوں میں
قہقہوں کا خون گرا تھا

پچھلے پہر کو
بھیگی رات کو
فوجی بوٹوں کی چاپ پر
سپنوں کا سنجوگ ٹوٹا تھا
اور دھرتی کی دراڑوں میں
گرم پہلو کا ساتھ گرا تھا

بادل بھر کے آؤ
اور خوب برسو!
جیسے اس دھرتی کی دراڑوں
سب سے
گندم کی بالیوں کے
آنسوؤں کے

گولیوں کے
مسکراہٹوں کے،
ناچوں کے
قہقہوں کے،
سپنوں کے،
سنگینوں کے

موتیوں کے
لوگوں کے
کوئی بیج پھوٹیں
ملہار ہوں
بادل بھر کے آؤ
اور خوب برسو
اور برسو
اور کیوں نہ برسو۔؟
اور کیوں نہ برسو۔!

(سندھی سے ترجمہ)

ابر آلود موسم خون آلود موسم

فیض پیرزادہ

شہید کردار تخلیق کر کے
تاریخ بن رہی ہے
عوامی نعرے، سوال ہیں
اور اُن کے پاس
گولیاں ہی ان کے
جواب ہیں۔
جلوس کے ساتھ
ابر آلود موسم پر بھی
گولی چلائی گئی ہے
لوگوں کے ساتھ
موسم کو بھی شہید کر دیا گیا ہے
ایسے موسم میں
کسی قریبی رشتے کو رونا
کتنا تکلیف دہ ہوگا۔!
بیوہ ہونے اور یتیم ہونے کا
ہر ہُنر سما تیار ہے

ہوائیں
پو پھٹتے
کھلتی کلیوں کی خوشبو میں
بارود کی بُو بھی بھر گئی ہے
دھوبی گھاٹ پر
کپڑوں کی میل کے ساتھ
تھوڑا سا خون بھی نکلا ہے
کپڑوں پر خون کے
چھینٹیں لگنے سے
اب نئے پھول بن گئے ہیں
شام تفریح کی نہیں
جلوس نکالنے کی گھڑی بن گئی ہے
سڑک پر بہا ہوا
خون کا ہر قطرہ
گلاب کا پھول لگ رہا ہے
خون آلود ٹوٹی ہوئی چوڑیاں
زخمی کلائی کا اشارہ ہیں
اِدھر اُدھر گرے ہوئے
چھلے، انگوٹھیاں
نشانیاں
پیار کرنے والوں کی
شہادت دے رہی ہیں

لوگوں اور موسم کے ساتھ
محبت کو بھی شہید کر دیا گیا ہے۔
کتنے ہی لوگ
جیلوں، ٹارچر سیلوں
میں ہیں۔
انڈر گراؤنڈ ہو گئے ہیں
میرے دیس کے پرندے بھی
گھونسلے چھوڑ کر، اڑ کر
جلاوطن ہو گئے ہیں
شام سمے
لوگ سرگوشی میں
ایک دوسرے کو
آج کی بات بتا رہے ہیں
کل کے لئے سوچ رہے ہیں
ایسے دور میں
مظلوموں کی حیثیت میں
گھروں میں مورچے بنا کر
رہنا ہو گا
پیار کرنے جیسے موسم میں
انسان
لہو کا سامان کر رہے ہیں
آج رات
اس کی پانی کی باری تھی

لیکن اس سے پہلے
شہید ہونے کی باری آگئی
لوگوں، موسم، اور محبت کے ساتھ
محنت کو بھی شہید کر دیا گیا ہے
خون بہا
رشتے نے بین کیا
بارش ہوئی
خون کا قطرہ
آنسو کا قطرہ

اور
بارش کا قطرہ
مل گئے
ابر آلود موسم
خون سے سرخ ہو گیا ہے
آنسوؤں میں بھیگ گیا ہے
ابر آلود موسم۔ خون آلود موسم
ہو گئی ہے۔!!

(سندھی سے ترجمہ)

پڙهندڙ نسُل . پ ن

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندڙ نسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرندڙ، اوسيئڙو ڪندڙ، ياڙي، ڪاٺُو، ياڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان ڪڍي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پڙهندڙ نَسل (پَـنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪـو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهـڙي دعويٰ ڪري ٿـو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪـڏهن ڪـو اهـڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.
جَهڙيءَ طرح وڻـن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَـنَ بہ مختَلِف آهـن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿـي سگهن ٿـا. بيـن لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.
ڪوشش اها هوندي تہ پَـنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پـر ممڪـن آهـي تـہ ڪـي ڪـم اُجرتـي بنيـادن تـي بہ ٿِيـن. اهـڙي حالت ۾ پَـنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَـرڻ جـي اُصـولَ هيـٺ ڏي وَٺُ ڪنـدا ۽ غيرتجـارتي non-commercial رهنـدا. پَنَـن پـاران ڪتـابن ڪـي ڊِجيٽـائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪـو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪـرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.
ڪتابن ڪي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ ڪان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪـڏهن ڪـو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَـن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ
کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکَڪَن، ڇپائيندڙن ۽
ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽ کي نہ مڃن.
شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ،
پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ
جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:
گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.
... ...
جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛
... ...
ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........
... ...
هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ -
اِن حسابَ سان اٽڪاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ
”هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ
وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻچاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، چالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪي پائي چيو تہ "منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ".
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)